زندگی کے موڑ پر

کرشن چندر

ایشیا پبلشرز۔ ۵ بہار گو لین ــــ تیس ہزاری دلّی

پروڈکشن — بھون چوپڑا

کتابت — اعجاز نبی

مطبوعہ — الجمعیتہ پریس دہلی

پبلشر — کملا چوپڑا

قیمت

سات روپے

آگہی کے نام

جواب اس دُنیا میں نہیں ......!

پیش لفظ

زندگی کے موڑ پر، تین طویل افسانوں پر مشتمل ہے۔ زندگی کے موڑ پر، گرجن کی ایک شام، بالکونی ـــــ ان افسانوں کا مرکزی موضوع انسانی محبت ہے۔

'زندگی کے موڑ پر' میرا پہلا طویل مختصر افسانہ ہے، اور شاید اب بھی مجھے یہ اپنے تمام افسانوں میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس میں وسطی پنجاب کے ایک قصبہ کا مرقع پیش کیا گیا ہے اور اس قصباتی پس منظر کو لیکر شادی۔ براہمنی نظام زندگی، عشق کی خودکشی اور ان سے متعلق مسائل سے پیدا ہونیوالے فکری اور جذباتی ماحول کی آئینہ داری کی گئی ہے۔ جہاں تک ان مسائل سے پیدا ہونیوالی فکری اور ذہنی الجھنوں کا تعلق ہے۔ آپ انکی نفسیاتی تشریح کی ایک واضح صورت اس کہانی میں دیکھیں گے۔ لیکن راہِ نجات ابھی بہت دور ہے۔

'گرجن کی ایک شام' ایسے علاقے سے تعلق رکھتی ہے جو موجودہ تہذیب کی ایک بہت بڑی نشاط گاہ (گلمرگ) سے چند قدم کے فاصلہ پر ہے۔ لیکن ان دونوں مقامات میں کسقدر فرق ہے، یہ آپ کو اس کہانی سے اور اس سے اگلی کہانی 'بالکونی' کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا۔ یہ چند قدم ہیں، لیکن ان میں ہزاروں سالوں کا بُعد ہے، 'گرجن کی ایک شام' قبائلی زندگی اور قبائلی زندگی میں محبت کی داستان پیش کرتی ہے۔ ایسے مقامات

اب ہندوستان میں معدوم ہوتے جارہے ہیں، 'گرجن کی ایک شام' کو آپ ایک جزیرہ سمجھیے جہاں سرمایہ دارانہ تہذیب کی روشنی ابھی تک نہیں پہنچی۔ سچی محبت جو جماعتی تضاد سے بالاتر ہو، اس جزیرے میں پنپ سکتی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ 'گرجن کی شام' ایک چھوٹا سا جزیرہ ہی تو ہے اور جب محبت اس جزیرے سے نکل کر کسی براعظم کی وسعتوں میں آنا چاہے تو۔ ؟

'بالکونی' اس مجموعے کی آخری کہانی ہے۔ اس میں گلمرگ کے ایک ہوٹل کا ذکر ہے اس ہوٹل کے کمروں میں ان کے لینے والوں میں آپ اپنی ملکی زندگی کا حیرت انگیز تنوع دیکھ سکیں گے۔ سیاست جس کی اساس نفرت پر قائم ہے۔ محبت جس کا دائرہ اس درجہ محدود اور جس کا تاثر اسقدر وقتی ہے، کہ اس کی صورت پہچانی نہیں جاتی۔ کردار، محبت کے اس غیر مربوط اور بے آہنگ رشتے سے اکتا کر راہِ فرار تلاش کرنے آئے ہیں۔ لیکن کیا کوئی راہِ فرار ممکن ہے۔ یہاں پہنچ کر ذہن مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی منفیت کو ترک کر کے راہِ نجات تلاش کرے۔

یہ افسانے مختلف موقعوں پر لمبے لمبے وقفوں کے بعد لکھے گئے ان کا ذہنی ربط اور آہنگ کسی اِرادیت کا نتیجہ نہیں، اسے لاشعور کی تخلیقی قوت سمجھیے یا محض اتفاق کہ یہ تینوں طویل مختصر افسانے ہیں، محبت ان کا مرکزی موضوع ہے۔ اور یہ محبت کے متعلق انسانی نظریے کے تدریجی ارتقا کو ظاہر کرتے ہیں۔

کرشن چندر

زندگی کے موڑ پر

"منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی"

(اقبال)

مُسافر

پرکاش وتی کا بیاہ تھا اور سوشیلا اور لیلا بیاہ دیکھنے کی خوشی میں نئے نئے کپڑے سلوا رہی تھیں، جارجٹ کی سبز ساڑھی اور زری کا فیتہ، نینون کا بادامی دوپٹہ اور اس کا جھلملاتا ہوا انقرئی کنارہ آنکھو کے نشے کی قمیص، اور امرت منتھن کی شلواریں عجیب عجیب سے بلاؤز جو دور سے دیکھنے میں ایسے معلوم ہوں گویا صرف چائے دانی کو ڈھانپنے کے کام آسکتے ہیں۔ لیکن جب سوشیلا اور لیلا انہیں پہن لیں تو گول گول قطع کئے ہوئے کناروں سے بازو ایسے نکل آئیں جیسے سیب کی شاخیں پھولوں کے بار سے جھک رہی ہوں۔ بچارا پرکاش چند سوشیلا اور لیلا کی طرف دیکھ دیکھ کر سوچتا کہ عورتیں بھی عجیب مصیبت ہیں۔ یہ پیدا ہوں تو مصیبت، اور نہ پیدا ہوں تب بھی مصیبت۔ لیلا نے نئے طلائی آویزے خرید لئے تھے۔ اور سوشیلا نے بلی کے پنجوں کی

طرح اپنے ناخن بڑھائے تھے، اور ہر روز انہیں پالش کیا کرتی، اور سوچتی کہ جب میری پور جائیں گے تو سوشیلا کے طلائی آویزوں کو کون پوچھے گا۔ ہاں، اس چھوٹے سے قصبے کی سب لڑکیاں اس کے سپید سپید لمبے ناخنوں کو دیکھ کر ضرور حیران ہوں گی۔ اری یہ کیا ہے؟ دیکھو تو بہن یہ لاہور کا نیا فیشن ہے کیا تجھے خبر نہیں سوشیلا اب کالج میں پڑھتی ہے۔ ہاں کالج میں، اور پھر کیسی کیسی عجیب باتیں ہوں گی، خوب لطف آئیگا ان کی باتیں سنکر، اور لیلا نے تو جب سے "پریم کی پکار" میں ہیروئن کے کانوں میں نئی وضع کے آویزے دیکھے تھے، اس کا دل للچا رہا تھا۔ اب پرکاش وتی کے بیاہ پر یہ موقع ملا تھا کہ وہ ان طلائی آویزوں کا تقاضا کرتی، اور یہ سب جانتے ہیں کہ آویزے جتنے لیلا کے کانوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور کسی کے کانوں میں نہیں ہوتے، اور پھر یہ آویزے بھی تو بہت اچھے تھے۔ لمبے لمبے سے، ایک چھوٹے سے طلائی گنبد کے نیچے ایک اس سے ذرا بڑا طلائی گنبد حتیٰ کہ یہ طلائی گنبد ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اس کی سپید بلوری گردن تک پہنچ جاتے تھے، یہ آویزے بالکل ایسے تھے جیسے مندر کے مندر لٹکے ہوئے لہرا رہے ہوں اور جب آئینے کے سامنے وہ گردن ایک طرف جھکا کر مسکرا دیتی، تو اس کا ہنسنا اور طلائی گنبدوں کا جھومنا، اور اس کے گالوں کا شہابی ہو جانا، یہ سب باتیں مل کر اس پر ایک نشہ سا طاری کر دیتیں، اور وہ سوچتی، کیا سوشیلا اور اس کے ناخن، اونہہ! یہ اور بات تھی کہ سوشیلا اس کی بہن تھی، بڑی بہن۔ لیکن جب پرکاش چند نے معصوم لہجہ میں نئے آویزوں کی تعریف کی، تو لیلا نے جواب دیا۔ "میں کیا کرتی بھائی جان،

میرے پاس کوئی اچھے آویزے ہی نہیں تھے۔ وہ پہلے تین جوڑے تو بالکل ہی بھدّے سے ہیں۔ کیا میں وہی پہن کر پرکاش کے بیاہ پر جاؤں۔؟"

اور سوشیلا نے ناخنوں پر پالش کرتے ہوئے نہایت بھولپن سے کہا۔ "بھائی جان آپ ہماری اُستانی مس سہگل کے ناخن دیکھیں تو بالکل حیران رہ جائیں، بالکل سپید بے داغ، سچے موتیوں کی طرح، میرے ناخنوں پر تو ویسی چمک آتی ہی نہیں۔ اور بھاپاجی[1] پرکاش کے بیاہ میں ہم یہاں سے بس پر جائیں گے یا ریل پر۔؟"

پرکاش وتی کے بیاہ سے دو دن پہلے، پرکاش چند، لیلا اور سوشیلا لاہور سے روانہ ہوئے، پرکاش کی ماں نے اپنے بیٹے کو خرچ کے لئے پچیس روپے دیئے۔ پرکاش وتی کے لئے پیلے رنگ کی جارجٹ کی ایک ساڑی اور دو روپے شگن کے، پھر بولی، "دیکھو نا، جب پرکاش ڈولی میں سوار ہو، تو اسے اپنے پاس سے دو روپے شگن کے اور دیدینا۔ اور ہاں دو روپے لڑکے کو بھی، دولہا کو، اور ـــــ بس کافی ہے۔!"

جب پرکاش اور لیلا اور سوشیلا گھر سے تانگے پر سوار ہوئے، تو پرکاش کی ماں نے کہا۔ "دیکھنا، بیٹا، ڈولی کے وقت، میرا خیال ہے، کہ بس دولہا دلہن دونوں

---

[1] وسطی پنجاب میں بڑے بھائی کو بھاپاجی، کہتے ہیں۔ مقامی رنگ قائم رکھنے کیلئے اس لفظ کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

کو ایک ایک روپیہ شگن دیدینا، آخر جب تمہارے بھائی کا بیاہ ہوا تھا، تو پرکاش نی کی ماں نے کون سے خزانے لٹا دیئے تھے۔ یہی ایک ایک روپیہ اس نے دونوں کو دیا تھا۔" اور کہا۔ "بس کافی ہے۔ اچھا بیٹیا جاؤ اب دیر نہ کرو۔"

لیکن جب تانگہ بالکل چلنے لگا تو پرکاش کی ماں نے پھر اشارے سے اسے ٹھہرا لیا۔ اور پرکاش کے قریب جا کر سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ "سوشیلا اور لیلا کو ننگے سر نہ پھرنے دینا، سری پور پرانی وضع کا شہر ہے، کوئی لاہور نہیں اور یہ عادت تو مجھے بہت ہی بری معلوم ہوتی ہے۔ اور پھر انہیں نینوں کے دوپٹے بھی نہ اوڑھنے دینا، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ کنواری لڑکیوں کو بہت ہنسنے بولنے بھی نہیں دینا چاہیئے، وہاں تو ہر وقت ڈھولک بجتی ہوگی۔ اسی لئے کہتی ہوں بیٹیا یہ دوآبے کے لوگ بڑے شکی مزاج ہوتے ہیں۔ ذرا کسی لڑکی کو ننگے سر دیکھ لیا۔ اور وہیں انگلی اٹھا دی، اور سر اٹھا کر چلنا بھی شریف زادیوں کا دستور نہیں۔ کم از کم دوآبے کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے، نظر نیچی، شرم اپنی اور......."

پرکاش نے گھبرا کر کہا۔ "بہت اچھا ماں، بہت اچھا۔!"

٭

ریل جا چکی تھی، اس لئے پرکاش، سوشیلا اور لیلا کو مجبوراً خضر بس کا آسرا لینا پڑا۔ دوپہر کے وقت خضر بس سروس کی لاری نے انہیں بٹالہ پہنچا دیا۔ بٹالہ پہنچ کر

انہوں نے سری پور جانے والی لاریوں کے اڈے کی تلاش کی۔ اور آخر انہوں نے اسے رابرٹس پارک کے قریب پایا۔ یہ ایک بالکل نئی دنیا تھی، پرکاش چند سو فیصد خالص شہری تھا۔ جس کی ساری زندگی لاہور کی گلیوں سڑکوں اور پارکوں میں چکر کاٹتے اور سیٹیاں بجاتے گذری تھی، یہاں پہنچ کر اس نے کچھ اور ہی نقشہ دیکھا، ایک بڑا سا پیپل کا درخت تھا اور اس کے نیچے تین بوسیدہ لاریاں، دائیں طرف رابرٹس پارک اور اس کے قریب ایک بڑا سا تالاب، تالاب میں پانی نام کو نہ تھا۔ رابرٹس پارک کے درختوں پر پتوں کا نشان نہ تھا۔ سامنے ایک لق و دق چٹیل میدان تھا۔ کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں، اور آک پر اُودے اُودے پھول آئے ہوئے تھے۔ مٹیالے رنگ کی کچی سڑک پر لاٹھی ٹیک کر چلتا ہوا ایک بوڑھا کسان نظر آرہا تھا۔ اور کہیں کہیں کھیتوں میں ہل چلے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اپنے لب کھولے ہوئے آسمان کی طرف تک رہے ہیں، کہ شاید کہیں سے پانی کی ایک بوند گر پڑے، واقعی ایک عجیب دنیا تھی۔ پرکاش نے اپنے ہیٹ کو دائیں طرف اور ترچھا کر لیا اور پھر ہمت سے کام لے کر اس نے ایک لاری میں لیٹے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا۔

"سری پور کو لاری یہاں سے جاتی ہے۔؟"

ڈرائیور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ——— "ہاں جناب، کیا کہا جناب آپ نے۔؟" میدے نے کہا۔

"سری پور۔؟"

ڈرائیور نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں جناب یہیں ہے۔"

فرنٹ سیٹ کو جھاڑتے ہوئے بولا۔ "تشریف رکھئے، ایک روپیہ کرایہ۔"

"کس وقت چلنا ہوگا۔؟"

"چار بجے، اب کیا وقت ہوگا جناب۔؟"

"اڑھائی۔!"

"بہت اچھا، بہت اچھا جناب۔ ابھی بہت وقت باقی ہے۔"

درمیانہ خانہ کھول کر پرکاش نے لیلا اور سوشیلا کو بٹھا دیا اور پھر بیٹ

اتار کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دیہاتی ڈرائیور کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"آپ ــــ سری لپو جا رہے ہیں۔!"

"ہاں۔!"

"کس کے ہاں۔!"

"لالہ خودی رام کے ہاں۔!"

"لالہ خودی رام۔! وہ جن کا بڑی ڈھاب کے پاس مکان ہے، ڈپٹی محمد حسین

کے ساتھ، وہ جن کا لڑکا ابھی چند دن ہوئے چین سے واپس آیا ہے، سنا ہے وہاں

روئی کے کسی کارخانے میں کام کرتا ہے۔ اس کی ہمشیرہ کی شادی آجکل ہونے والی

ہے۔ جو......"

"ہاں، ہاں، وہی۔"

"میرے خیال میں آپ پہلے تو کبھی سری پور نہیں گئے۔"

"نہیں۔"

"جی ہاں، مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے، میں نے آپ کو پہلے وہاں کبھی نہیں دیکھا۔ سری پور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، اور ہم کس کو نہیں جانتے! لالہ خود ی رام سے تو میں بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ بڑے نیک آدمی ہیں، ان کا گھر ڈپٹی محمد حسین کے گھر کے ساتھ ہے۔ ڈپٹی صاحب بھی بڑے نیک آدمی ہیں۔ کیا بتاؤں جی، ڈپٹی صاحب کا بڑا لڑکا خوش شکل اور نیک طینت تھا، طبیعت میں کھوٹ نام کو نہ تھا، پہلوان تھا جی پہلوان ہمارے سری پور میں کشتی ہوئی، ڈپٹی کمشنر صاحب بھی میلے پر آئے ہوئے تھے، وہاں اس نے کشتی کی اور اللہ بخش کو ہرا دیا اللہ بخش بھی تگڑا پہلوان ہے۔ مگر ہار گیا جی، کیا بتاؤں جی بڑا اچھا آدمی تھا۔ ضلعداری کا امیدوار تھا۔ لیکن دو ہفتے ہوئے بچارے کو کسی نے راتوں رات قتل کر دیا۔ ہمارے ضلع میں بہت قتل ہوتے ہیں۔ قتل اور چالان، ابھی پچھلے مہینے میں میرا کوئی سات مرتبہ چالان ہو چکا ہے۔ کیا کریں۔ بابو جی سڑکیں بالکل کچی ہیں، گاڑیوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ یہ لاری میں نے دو سال ہوئے نئی لی تھی، آج آپ اس کی حالت دیکھیں۔ پائدان، پہیئے، بریکیں، مڈگارڈ سب خراب ہو گئے ہیں۔ فضلے کی گاڑی اس سے بھی بری حالت میں ہے ———

"او فضل، او فضل، ابے حرامی، اٹھ! دیکھتا کیا ہے، چل اسٹیشن پر چلیں، سواریاں لے آئیں، دیر ہو رہی ہے سورج چھپا چاہتا ہے۔ آج رات کو میری شادی جی کے گھر

دعوت ہے، سواری لے نہ لے، دعوت پر پہنچنا ہی ہے۔"

اتنا کہہ کر رجب علی ڈرائیور فضل دین ڈرائیور کو ساتھ لے کر ریلوے اسٹیشن کی طرف سواریاں لینے چلا گیا، اور پرکاش چند کو چند لمحوں کے لیے بھونچکا سا چھوڑ گیا۔

ساڑھے چار بجے کے قریب جب لاری چلنے کو ہی تھی تو لالہ گھسیٹا رام سڑک پر ہانپتے ہوئے آتے دکھائی دیے اور رجب علی کو انجن بند کرنا پڑا۔ پرکاش چند کی طرف دیکھ کر رجب علی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "لالہ جی سری پور کے بڑے ساہوکار ہیں اور یوں بھی مجھ سے یہ تو نہیں ہو سکتا، کہ اپنے قصبے کے کسی آدمی کو یہاں رات بتانے یا دھکے کھانے کے لیے چھوڑ جاؤں، مجبوری ہے، اگرچہ لاری تو اب بھر چکی ہے۔"

لاری واقعی بھر چکی تھی، درمیانی درجہ میں جو عورتوں کے لیے تھا، سوشیلا اور لیلا کے علاوہ آٹھ دیہاتنیں بیٹھی ہوئی تھیں، اور سوشیلا اور لیلا کے خوبصورت کپڑوں کی طرف دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں، یہ حیرانی دبی دبی سی تھی۔ ان سے پرے تیسرے درجے میں اور لاری کی چھت کے اوپر بھی جاٹ بیٹھے ہوئے تھے چنانچہ جب لالہ گھسیٹا رام لاری کے قریب پہنچے تو رجب علی نے کہا۔

"آؤ جی شاہ۔!"

"کہاں بیٹھوں۔؟" لالہ گھسیٹا رام نے کہا۔

رجب علی نے ایک نظر پیچھے کی طرف دوڑائی، پھر آہستہ سے بولا- "یہیں میرے
پاس بیٹھ جائیے۔" لالہ گھسیٹا رام رجب علی کے قریب بیٹھ گئے۔ ان کا چہرہ سرخ تھا اور
چیچک کے داغ اس طرح دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے راستے کی مٹی پر بارش کے چند
قطرے۔ دونوں ہاتھوں کی چھنگلیوں پر سونے کی انگوٹھیاں تھیں، اور گلے میں دانتوں
کو صاف کرنے والا سونے کا خلال، کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں تھیں

"بھائی رجب۔" لالہ گھسیٹا رام نے آرام کا ایک لمبا سانس لیکر کہا۔

"میں تو کچہری سے بھاگتا ہوا آیا ہوں، امید نہ تھی کہ لاری مل جائے گی۔"

رجب علی نے پھر انجن کھولا- ایک پولیس کا سپاہی جس کو سری پور جانا تھا،
ڈرائیور کی کھڑکی کے قریب مڈگارڈ پر کھڑا ہو گیا- لاری آہستہ آہستہ چلنے لگی

سوشیلا اور لیلا بولیں۔ "بھاپا جی-!"

"کیوں-؟" پرکاش نے پوچھا-

"دم گھٹا جا رہا ہے-"

رجب علی بولا- "بی بی جی، ابھی لاری زور سے چلے گی، تو خوب ہوا آئے گی۔"
لالہ گھسیٹا رام نے ایک نظر پرکاش چندر پر ڈالی اور ایک سوشیلا اور
لیلا پر، پھر بولا-

"آپ لالہ خوشی رام کے ہاں جا رہے ہوں گے، پرکاش چند؟ ان کے ہاں شادی ہے نا!"

"جی-" پرکاش بولا-

تیسرے درجے میں دو تین جاٹ زور زور سے باتیں کرنے لگے، ایک بولا۔
"میں نے تو موجے سے کہا تھا کہ گواہی نہ دینا، وہ بنیا بڑا بدمعاش ہے۔"

دوسرا بولا۔ "موجے خود کہاں کا شریف ٹھہرا۔"

تیسرا کہنے لگا۔ "موجے پھر جاٹ بھائی ہے۔ لیکن وہ مہاجن ہے۔ کھتری بھی نہیں۔"

لالہ تیج رام نے رجب علی سے کہا، زمانے کو تو جیسے آگ لگ گئی ہے۔ "بھائی، بھائی بھائی دشمن۔ اب تو بنج بیوپار کا زمانہ نہیں رہا۔ ابھی ہمارا راستہ میں سیٹھ رنگ لال کے لڑکے کو سمجھا رہا تھا کہ جاٹوں کو روپیہ قرضہ نہ دو۔ سرکار سب قرضے معاف کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔ وہ اگر دوسرے بیوپاریوں کو ادھار دو تو ساتھ ساتھ وصولی بھی کرتے رہو۔ ادھر ادھار دیا۔ ادھر وصولی کے لئے اپنا آدمی بھی دوڑا دیا۔ یہ آجکل کے بیوپار کا گر ہے۔"

رجب علی آہستہ سے بولا۔ "کمبخت پیسہ کام نہیں کرتا۔"

درمیانے درجے میں کالے رنگ کے لہنگے پہنے ہوئے ادھیڑ عمر کی دو عورتیں باتیں کر رہی تھیں: "اس کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ تیرہ سال کی عمر میں ودھوا، ساری عمر مرنے والے کو روئے گی۔ بے چاری کے بھاگ۔ میں نے کریا پر دو ململ کے دوپٹے اور تین روپے نقد بھیج دیے تھے۔ لیکن کریوں کی ماں تو بڑی کمینی اور بے مروت نکلی۔"

ایک جاٹ عورت جس کے کانوں میں چاندی کی بڑی بڑی بالیاں پڑی ہوئی تھیں، بار بار اپنے بچے کو سلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، اس کے ساتھ کی

عورت تنگ آ کر بولی۔ "بہن اسے چھاتی کیوں نہیں دیتی۔؟"

"میں تو چھاتی دیتی ہوں۔ مگر یہ پیتا ہی نہیں۔ شاید اس کے پیٹ میں درد ہے۔

اُر رر۔آ۔آ۔آ۔اس۔اس۔ای۔ای۔سو جا میرے لال۔سو جا ___ ہائے مر جا تو،

جان کھائے جاتا ہے۔"

رجب علی گھنٹیال کی طرف اٹھ کر بولا: "پشن کام نہیں کرتا شاید۔" لیکن

گھنٹیال پر کاش چند کی سیٹ پر جھکا ہوا اونگھ رہا تھا۔

پچھلے درجے میں تحصیل کا ایک چپڑاسی ایک جاٹ سے جھگڑ رہا تھا۔ "مالیہ

پچاس فی صدی کم ہو، آبیانہ ہٹا دیا جائے۔ چوکیدارہ بند ہو جائے تو سرکار کا کام

کیسے چلے۔؟"

جاٹ بولا۔ "پہلے کیسے چلتا تھا جب حاکم کی تنخواہ پانچ روپے ہوتی تھی۔"

"تم سکھا شاہی چاہتے ہو۔؟"

"نہیں جٹا شاہی۔" ایک اور جاٹ نے جواب دیا۔

ایک کسان عورت دوسری سے کہنے لگی: "بچن کی ماں دلدار سنگھ کے ساتھ

بھاگ گئی ہے، تم نے سنا۔؟"

"اب بچن کا باپ ٹکوائے ان کی تلاش میں پھرتا ہے۔"

پرکاش چند کے ذہن میں چوتھی جماعت کی اردو کی کتاب کا ایک سبق گھوم

گیا۔ دیہاتی اور شہری زندگی کا موازنہ، دیہات کی زندگی کتنی دلکش اور پر لطف ہوتی

کے ایک بڑے درخت کے نیچے گائیں اور بھینسیں آرام کر رہی تھیں، لیکن ان کا رکھوالا
نہ تھا...... یہ ایک گاؤں تھا۔ سڑک کے اس طرف لاری ایک گندے جوہڑ کے قریب
سے گزر رہی تھی۔ ایک بھینس پانی میں گھس رہی تھی۔ ایک عورت خاکی رنگ کی قمیض اور
کالے رنگ کا لہنگا پہنے پانی بھر رہی تھی۔ ایک لڑکی، سڈول اور سانولی بانہوں والی
نوجوان لڑکی، ڈنڈے سے چند بھیگے ہوئے کپڑے کوٹ رہی تھی۔ سڑک کی دوسری طرف
ایک بڑا سا بڑ نظر آ رہا تھا، جس پر ڈاک کے لئے سرخ ڈبہ لٹکا ہوا تھا۔ درخت کے نیچے
ایک ٹوٹا ہوا چھکڑا پڑا تھا، اس پر چار سکھ جاٹ ایک بھدی میلی تاش کھیل رہے تھے۔ پھر
وہی میدان تھا، وہی ریتیلی سڑک، وہی تیز دھوپ اور میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت

پرکاش چند نے سوچا، زندگی نہ دیہاتی ہوتی ہے نہ شہری، بلکہ محض "زندگی" کوئی
اس کا کوٹ پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ پرکاش چند نے مڑ کر دیکھا، ایک چھوٹا سا خوبصورت بچہ!
اپنی ماں کے کندھے سے لگا ہوا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کا کوٹ پکڑ رہا تھا۔ اس
کی ماں سیٹ سے سر لگائے سو گئی تھی۔ وہ اس کا ایک رُخ دیکھ سکتا تھا۔ ایک جوان جاٹ
عورت، گندمی سا رنگ، کان میں سونے کی بالیاں، تیکھے نقش، لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے
رخساروں پر صف باندھ رکھی تھی۔

بچہ پرکاش چند کو اپنی طرف مڑتے ہوئے دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے حیران ہو گیا۔
پھر خود بخود ہنس پڑا، اور اس کا کوٹ کھینچتے ہوئے بولا۔ "او تو ــــ تو ــــ لی"

پرکاش چند نے اسے ایک سنگترہ دیا، اور بچے نے اس کا کوٹ چھوڑ دیا۔ اور

گنگنایا۔ "ادتو ــــ لو ــــ لی۔ او۔"

جاٹ عورت بیدار ہو گئی، اس کی آنکھیں کھلتے ہی پرکاش چند کو محسوس ہوا۔ گویا کہیں آسمان پر یکایک دو ستارے روشن ہو گئے ہیں، جب ماں نے اپنے بچے کے ہاتھ میں سنگترہ دیکھا تو اس کے خواب آلود چہرے پر اس کے نیم متبسم لب، پرکاش چند کو بہت دلفریب معلوم ہوئے، اس کے شباب میں اس نے ایک آسودگی اور دوشیزگی سی محسوس کی اور اسے خیال آیا کہ دیہاتی زندگی شہری زندگی سے کہیں بہتر ہے۔

لاری چلتے چلتے تھم گئی، ایک بوڑھی عورت ایک چھوٹی سی لڑکی کو ساتھ لئے راستے کے بیچ میں کھڑی تھی۔ بولی۔ "ہمیں سری پور جانا ہے۔"

رجب علی بولا۔ "اماں، جگہ تو بالکل نہیں۔"

بوڑھی عورت بولی۔ "بٹیا، میں سہارا لیکر کہیں کھڑی ہو جاؤں گی، ہاں مگر تو اس میری لڑکی کو کسی کونے میں بٹھا دے۔" رجب علی نے ایک کسان سے کہا کہ وہ لاری کی چھت پر چلا جائے۔ اور بوڑھی عورت کے لئے جگہ خالی کر دے۔ کسان لاری کی چھت پر چلا گیا۔ جہاں پہلے ہی چار پانچ دیہاتی بیٹھے ہوئے تھے اور جب لاری چلی تو انہوں نے گانا شروع کیا۔

ادنتو ــــــــــ

بنتو داسر جنا ورگا

بنتو دا منہ چن ورگا

نبتو دالک چیڑا

اور نبتو ـــــــ

پرکاش نے دل ہی دل میں جاٹ کی شاعری کی تعریف کی، نبتو ایک جاٹ کی بچی ہے۔ اس کے سر کے بال ایسے ہیں جیسے ایک وسیع جنگل، اس کا چہرہ چاند اور انکھیں کمر چیتے کی سی، جاٹ کی شاعری میں اس کے دیہات کے کھلے کھیتوں کی سی وسعت مگر سادگی پائی جاتی ہے۔ پرکاش نے چور نگاہوں سے پھر نوجوان عورت کی طرف دیکھا، بچے نے اس کا کوٹ پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے، اور نوجوان عورت کی نگاہیں پرکاش کی نگاہوں سے مل گئیں۔

لاری نہر کے پل پر سے گزر گئی، آگے جا کر ایک کنواں آیا۔ وہاں لاری ٹھہر گئی۔ اور مسافر پانی پینے لگے، پرکاش نے چاندی کا سفری گلاس نکالا اور موسیٰ ... پلانے لگا۔ جب وہ پانی پی چکیں تو نوجوان عورت نے بھی آہستہ سے پانی پینے کی خواہش ظاہر کی۔ پانی واقعی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ پرکاش نے دیہاتی عورت کو پانی پیتے ہوئے محسوس کیا کہ ان میں ایک فطری شائستگی ہوتی ہے۔ دیہاتی عورتوں میں، بچہ بڑا شریر تھا، اس نے پانی پیتے ہوئے گلاس کے پانی میں اپنے سانس سے بلبلے پیدا کرنے شروع کر دیئے اور اس کی ماں نے آہستہ سے گلاس اس کے ہاتھ سے چھین کر پانی نیچے گرا دیا۔ اور پھر محجوب نگاہوں سے پرکاش کی طرف دیکھ کر گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

چند میل آگے جا کر نوجوان عورت لاری سے اتر گئی، اسے سامنے کے ایک گاؤں

شے جلتا تھا۔ اور نے اترتے ہی اس نے سرسوں کے ساگ کی سبز سبز کونپلوں کا گٹھا اپنے سر پر رکھ لیا۔ اور بچے کو کمر کے خم میں۔ اس نے ایک نگاہ پرکاش پر ڈالی گویا کہہ رہی تھی، مجھے اچھی طرح دیکھ لو۔ ہم تم پھر کبھی نہیں ملیں گے، میں اب اپنے گھر جا رہی ہوں۔ جہاں میرا خاوند اپنی بنتو کا انتظار کر رہا ہے۔ میں کماد کی فصل کاٹوں گی۔ گیہوں کی بالیاں الگ کروں گی اور باجرے کی روٹیاں اور چھاچھ کی ٹھلیا لے کر اپنے گھر والے کے پاس کھیتوں میں جاؤں گی۔ یہی وہ پگڈنڈی ہے۔ جہاں سے میرا اور تمہارا راستہ ہمیشہ کے لئے الگ ہوتا ہے۔

اور پرکاش جو باغیانہ خیالات رکھتا تھا۔ اپنے دل میں کہنے لگا۔ ٹھیک ہے بنتو، اس میں میرا یا تمہارا کوئی قصور نہیں، یہ سماج کا قصور ہے، اس زندگی میں اب کوئی خالص مرد یا عورت نہیں، بھائی، بہن، خاوند، بیوی، بھانجا، بھتیجی، ماموں، پھوپھی اور خالہ ہیں، لیکن ایسا کوئی نہیں جو اپنے آپ کو مرد یا عورت کہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔

نوجوان عورت آہستہ سے پگڈنڈی پر مڑ گئی، اس کی، ہلکے سبز رنگ کی قمیص پر روپہلی کناری دھوپ میں چمک رہی تھی۔

پرکاش نے دل میں کہا۔ خدا حافظ، خدا حافظ اس لئے کہ ہم انسان ہیں لیکن اگر انسان نہ ہوتے بلکہ کبوتر یا چڑیا.......تو....... اور پرکاش کے شاعرانہ تخیل نے دیکھا، کہ وہ دونوں کبوتر بن گئے، اور اپنے سفید پر پھیلائے ہوئے اڑے جا رہے ہیں۔ نڈر، بے باک، خوش، نہیں وہ چڑیوں کا ایک جوڑا تھے، اور ایک دوسرے سے بچھڑ گئے

ہوئے، ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے، ایک دوسرے پر جھپٹتے ہوئے اڑے جا رہے تھے، سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا اور کیکر دں پر پیلے پیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ مغربی آسمان پر شفق کی سرخی تھی اور سطح زمین پر ایک سنہری دھند، کیکر کی پتلی گھنی اور خاردار ٹہنیوں کے بیچ میں سورج کی کرنوں نے ایک زریں گھونسلا بُن دیا تھا۔

نیتوا اڑ کر گھونسلے میں جا بیٹھی، پر پھیلائے ہوئے پرکاش کی طرف دیکھنے لگی اور چہکنے لگی "چ۔ چ۔ چوں چوں۔" پرکاش نے اپنی چونچ اس کی چونچ سے ملا دی۔ اور کیکر کے بہت سے پیلے پیلے پھول ان کے پروں پر گر پڑے۔ یکا یک رجب علی بولا۔

"یہ پسٹن کام نہیں کرتا۔"

محور

سری پور کا قصبہ دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے، یہ قصبہ کسی زمانے میں ایک اچھا خاصا شہر تھا۔ اسے سکھوں کے ایک مقدس گورو نے چند اونچے ٹیلوں پر بسایا تھا۔ لیکن ان اونچے ٹیلوں پر آہستہ آہستہ دریا کی لہریں چھا گئیں، پھر گیہوں کی درآمد کم ہو گئی اور اونچی اونچی حویلیاں کھنڈر بن کر رہ گئیں۔ وقت، مذہب کا بھی پاس نہیں کرتا۔

چنانچہ سری پور کا مقدس شہر استدادِ زمانہ سے ایک معمولی سا قصبہ بن کر رہ گیا۔ ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ جہاں اکثر دوکانوں پر حقہ گڑ گڑایا جا رہا تھا۔ یا تاش کھیلی جا رہی تھی۔ نحیف اور ادھ موئے سے کتے بازار کی نالیوں میں لیٹے ہوئے تھے۔ اور دو تین آوارہ گدھے اپنے لمبے لمبے کان ہلاتے، بازار کی رونق دیکھتے ہوئے جا رہے تھے۔ کیونکہ آج بازار میں دو رویہ رنگ برنگ کی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں یہ جھنڈیاں بازار کے پہلے دروازے سے شروع ہو کر، جہاں لاری کا اڈہ تھا، لالہ کھیدی رام کے گھر تک لگی ہوئی تھیں۔ جو ایک چھوٹی سی جھیل کے قریب واقع تھا۔ یہ جھیل اسی زمانے میں ایک اونچا ٹیلہ تھی۔ اب دریائے بیاس کے پانی سے بھری ہوئی تھی۔ پرکاش چند نے سوچا، اس قصبے میں کتنا امن ہے۔ اچھا تو یہ دیہات ہے۔ یہاں تو لوگوں کو کوئی کام نہیں۔ زندگی کی رفتار کتنی مدھم اور سکون آمیز ہے۔ دریائے بیاس کے پانی کی طرح، یہاں آدمی چاہے دن بھر تاش کھیلے۔ چاہے چرخہ چلائے، بہر صورت چرخہ تاش سے بہتر ہے۔ اس نے دل ہی دل میں گاندھی جی کی فراستِ طبع کی داد دی۔ چند ایک لوگوں نے اسے گھور کر دیکھا۔ سوشیلا اور لیلا اس کے ساتھ ساتھ لگی چلی آ رہی تھیں۔ ان کے بھڑکیلے لباس جو بازار میں لگی ہوئی جھنڈیوں کی طرح رنگین اور جاذب نظر تھے۔ کتنوں ہی کی نظروں کو خیرہ کرتے رہے۔ ایک دوکان پہ ایک گاڑی بان چھکڑے پر سے بنولے کی بوریاں اتار کر رکھ رہا تھا، وہ انہیں دیکھ کر بنولے کی بوریاں اتارنا بھول گیا۔ پھر اس کے لبوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اسے جیسے کوئی بھولی

ہوئی بات یاد آگئی۔ اور اس کا چہرہ جیسے کسی اُلجھن سے فوراً صاف ہوگیا۔ جب سوشیلا
لیلا اور پرکاش چند اس کے قریب سے گزرے تو گاڑی بان بڑے مزے سے گنگنایا۔
اک بنگلہ بنے نیارا........
اور پھر بنولے کی بوریاں دوکان پر پھینکنے لگا۔ سوشیلا اور لیلا کے چہرے شرم
سے گلابی ہو گئے اور پرکاش چند نے سوچا کہ ہندوستانی غریب طبقوں میں بھی شخصی جائداد
کی حس کتنی تیز اور شدید ہے۔ اس بنگلے کی ہوس نے ہمیں بزدل غلام اور خوشامدی
بنا دیا ہے۔ ایک ہندوستانی کی جنّت تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ بیوی، بچّہ اور بنگلہ
لالہ خودی رام کے مکان کے دروازے پر بینڈ بج رہا تھا۔ پرکاش چند نے لالہ خودی
رام کے پاؤں چھوئے اور سوشیلا اور لیلا نے ایک کونے میں سمٹ کر ہاتھ جوڑ دیے
لالہ خودی رام کا لڑکا بیر اندر سے بھاگتا آیا اور پرکاش چند کے گلے لگ گیا۔ وہ
دونوں چار سال کے بعد ایک دوسرے سے ملے تھے۔ بیر اب پہلے سے لمبا اور
مضبوط اور جوان ہوگیا تھا، چین کے دُور دراز ملک میں رہ کر اس نے دنیا کے
بہت سے نشیب و فراز دیکھ لئے تھے، اس کے لہجہ میں خودداری تھی اور بلند
حوصلگی، اور خود اعتمادی، جب وہ سری یورپ گیا تھا، تو بالکل ایک لڑکا سا تھا
چہرے پر خط بھی نہ آیا تھا اور بالکل کالج کے لڑکوں کی طرح باتیں کیا کرتا تھا۔ اور
اب...... اب پرکاش چند کو افسوس ہوا کہ وہ خود کیوں اتنے عرصہ تک لاہور
کے کنوئیں کا مینڈک بنا رہا، ماحول کا اثر، تن آسانی یا ایک جبلی کمزوری، لالہ خودی رام

کے گھر کے اندر پرکاش چند کی خالاؤں، پھوپھیوں، بھانجیوں، بھتیجیوں اور رشتے کی
بہنوں کا شمار نہ تھا۔ انہوں نے سوشیلا اور لیلا کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پانچ منٹ میں
ان کے پاؤں سے سٹریم لائن (STREAMLINE) سینڈلوں سے لیکر کانوں کے
آویزوں تک کو پرکھ کر رکھ دیا۔ بالاتفاق رائے پاس ہوا کہ سوشیلا اور لیلا دونوں لاہور
کی میمیں ہیں، سوشیلا کے لمبے لمبے ناخن دیکھ کر کئی لڑکیوں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔
ناخنوں پر سرخ رنگ کا پالش کیا گیا تھا۔ جس کی یاقوتی چمک کے آگے حنائی رنگت
ماند ہو گئی تھی۔ "ارے ...... بہنا یہ کیا چیز ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ پتہ، پتہ۔
لکھ دو یہ" لیلا کا چہرہ غصے سے بیر بہوٹی ہوا جا رہا تھا۔ اس کے طلائی آویزوں کی
طرف اب کسی کی توجہ نہیں رہی تھی۔ یہ چڑیلیں چلا چلا کر سوشیلا کے ناخنوں کو سراہ
رہی تھیں۔ لیلا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "مردار جلیاں کہیں کی۔ اگر مجھے پتہ
ہوتا......" آنگن میں چارپائی پر پرکاش اور بیر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بیر کی
ماں مسکراتی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔ اس نے ریشمی اودے پھول دار شلوار پہن رکھی تھی۔
زعفرانی قمیص اور سر پر سنہری کنارے والا سرخ دوپٹہ تھا۔ دوپٹہ تھا۔ دونوں ہاتھوں
میں دو انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ بیر کی ماں نے مسکراتے ہوئے پرکاش کی ماں کا پرکاش
دلی کی شادی پر نہ آنے کا شکوہ کیا۔ بیر نے بھی جھوٹ موٹ غصے کا اظہار کیا اور پرکاش
نے بھی کچھ اس طرح سر جھکا کر شرمساری اور ندامت دکھائی کہ ہر ایک کی عزت رہ گئی۔ اور
کسی کی بات بگڑنے نہ پائی کیونکہ اس بات کا تو ہر ایک کو پتہ تھا، کہ اگر شادی پر خاندان

کے تمام قرابت دار اپنے گھر کے تمام لوگوں کو لیکر چلے آئیں تو جہاں جنگل میں منگل ہو سکتا ہے، وہاں منگل ہونے والے جنگل میں بھی آگ لگ سکتی ہے یعنی ایک پوری بارات گھر کے دروازے کے اندر رہوگی۔ اور ایک باہر۔ اور اگرچہ بعض پرانے خیالات کے لوگوں کے نزدیک لطف کی بات یہی ہے۔ کہ دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی۔ لیکن بیر کی ماں ان لوگوں میں سے نہیں تھی۔ اس لئے جب پرکاش نے معذرت پیش کی کہ آخر پیچھے گھر میں کسی کا رہنا ضروری تھا۔ تو وہ سنکر اور اس کے سر کی بلائیں لے کر وہاں سے چلی گئی۔ پرکاش نے بیر سے پوچھا کہ جیٹھ کیسا ملک ہے۔ اور بیر جواب دینے ہی کو تھا کہ رک گیا، کیونکہ ایک حسین شرمیلی لڑکی جس کی بڑی سیاہ آنکھوں میں کنوارپنے کی نازک پاکیزگی کانپ رہی تھی۔ ان کی طرف جھجکتے ہوئے قدموں سے بڑھی چلی آرہی تھی۔ اور جب وہ بالکل ہی قریب آگئی تو بیر کے لب کانپنے لگے، اور لڑکی کے رخسار گلاب کے پھول بن گئے۔ اس نے اپنی آنکھوں کو پلکوں کے پردے میں چھپا لیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لسی کے دو گلاس تھام رکھے تھے۔ وہ ان کے قریب آکر کھڑی ہو گئی اور منہ سے کچھ نہ بولی۔ بیر نے آہستہ سے جیسے وہ گلاب کی کسی پتی کو چھو رہا ہو۔ اس کے ہاتھوں سے گلاس لے لئے۔ اور ایک گلاس پرکاش کے ہاتھ میں دیکر دوسرا اپنے منہ تک لے گیا۔ لڑکی اب بھی خاموش تھی۔ لیکن پرکاش نے ایک لمحہ کے لئے اس کی پلکیں اٹھتی ہوئی دیکھیں۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے اس لڑکی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پرکاش کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ آہ۔ یہ دل کی دھڑکن۔ اس نے سوچا

کبھی کبھی کسی خوبصورت چیز کو دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ رکے ہوئے خون میں طوفانی ریلے آجاتے ہیں۔ شاید اسکی حسن کا احساس پوری طرح مرا نہیں۔ دفتر کی میز نے ابھی اس کی روح کو کچل نہیں دیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد پرکاش نے پوچھا۔ "یہ کون تھی؟"

بیر نے کہا۔ "چین بہت اچھا ملک ہے۔"

پرکاش نے کہا۔ "میرا اشارہ اس لڑکی کی طرف تھا جو لسی کے دو گلاس ہمارے لئے لائی تھی۔"

بیر نے کہا۔ "چین کے لوگ افیون کھانے اور چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کی زندگی ......"

پرکاش چارپائی سے اٹھ بیٹھا۔ کہنے لگا۔ "بھاڑ میں جائے ان کی زندگی۔ ہماری زندگی کب ان سے بہتر ہے اور تم یہاں چینیوں کا داؤ ہم پر آزمانا چاہتے ہو۔ ذرا سنبھل کر چلنا۔ یہ شنگھائی نہیں۔ سری پور ہے، چینیوں کا خدا ہمارا خدا نہیں۔ ہماری زندگیاں چینی کے برتنوں کی طرح خوبصورت نہیں۔ بلکہ مٹی کے برتنوں کی طرح میلی اور ناصاف ہیں لیکن میں کس گدھے سے بات کر رہا ہوں۔ اچھا میں کوٹھے پر چلتا ہوں۔ ذرا پرکاش وتی سے دو میٹھی میٹھی گالیاں سن آؤں۔"

بیر نے کہا۔ "پرکاش وتی سے مل کر باہر بیٹھک میں آجانا۔ تمہیں اپنے چند نئے دوستوں سے ملاؤں گا۔"

پرکاش وتی دوسری منزل میں ایک کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ پرکاش کا خیال تھا کہ وہ بہت سی لڑکیوں میں گھری ہوگی اور اسے دو چار میٹھی گالیاں سننے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ لیکن حسن اتفاق سے وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ پرکاش بہت خوش ہوا۔ اس نے پرکاش وتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی حنائی انگلیوں کو زور زور سے مسلنے لگا۔ لیکن پرکاش وتی بولی نہیں۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے پرکاش وتی کی ٹھوڑی کو اونچا کیا اور کہنے لگا۔ "سنتی ہو بہن! تمہارا بھائی تمہیں بدھائی دینے آیا ہے اور تم ہو کہ اپنی آنکھوں میں آنسو رو کے بیٹھی ہو۔؟"

اور پرکاش وتی سچ مچ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی تھی۔ یہ بات سنتے ہی وہ ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ پرکاش بولا۔ "تو تو کہتی تھی کہ میں بی۔ اے پاس کر کے نوکری کروں گی یا کہانیاں لکھوں گی۔ اب بتا یہاں تو تجھے کسی نے گیارھویں جماعت سے آگے نہیں پڑھایا۔ اور تو تو شاید فلم ایکٹریس بننا چاہتی تھی۔ اب وہ اداکاری کے ولولے کہاں گئے۔؟ تیرے وہ سونے کے تمغے جو تو نے مہا ودیالہ میں ناچ ناچ کر حاصل کئے تھے اب کہاں ہیں۔؟"

پرکاش وتی نے رو کر کہا۔ "اسی لئے تم مجھے جلانے آئے ہو۔ کیا میں اب تم سے بھی ہمدردی کی امید نہ رکھوں۔!"

پرکاش چپ رہا اور چند لمحوں تک آنسوؤں کی ان دو ندیوں کی طرف تکتا رہا جو اپنی روانی میں زندگی کے پورے نہ ہونے والے سپنوں کو بہائے لئے جارہی تھیں۔ اسے

پرکاش وتی سے بہت محبت تھی۔ پرکاش وتی اسے بہنوں کی طرح عزیز تھی۔ شاید بہنوں سے زیادہ۔ کیونکہ سارے خاندان میں وہی ایک لڑکی تھی جو اس کی طرح ادبی مذاق رکھتی تھی۔ اسے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بہت اچھا گاتی تھی اور تیتری کی طرح ناچ سکتی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی۔ کہ پرکاش وتی کی شادی کسی اچھے آدمی سے ہو۔ اس کی مراد ایسے آدمی سے تھی جسے عام لوگ برا کہتے ہیں، مثلاً ایک خوبصورت طرحدار نوجوان جسے اچھے لباس کا شوق ہو، جو گانے اور ناچنے کا شوقین ہو، جو حسن کی قدر کر سکے۔ پڑھا لکھا ہو اور کبھی کبھی کوئی شعر گنگنا سکے۔ غرض کہ ایک ایسا آدمی جو ہندوؤں کے متوسط طبقے کی مستورات میں بہ نظر حقارت دیکھا جاتا ہو۔ اور اسے یہ بھی پتہ تھا کہ پرکاش وتی کی بھی یہی مرضی تھی۔ لیکن نہ تو پرکاش وتی میں اپنی مرضی برتنے کی ہمت تھی اور نہ اس کے ماں باپ کا تخیل اس قدر بلند تھا۔ وہ "بے حیا" نہ تھے انہوں نے کبھی سینما تک نہیں دیکھا تھا۔ اور زندگی بھر اپنے بالوں میں آملے کا تیل درجہ اول کا نہیں لگایا تھا۔ نہ کبھی ٹیڑھی مانگ نکالی تھی۔ ان کے وقت میں اسکولوں میں ناچ اور گانے نہیں سکھائے جاتے تھے۔ بلکہ لوگ باشنٹ اور آستی باچن پڑھائے جاتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے اپنی لڑکی کو گیارہ جماعت تک پڑھایا تھا۔ اسے سری پور کے گاؤں سے دور ایک دوسرے شہر کے مہاودیالہ میں داخل کرایا تھا۔ لیکن شادی کے معاملہ میں وہ بے حیائی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے سوچ بچار کر اور اچھی طرح دیکھ بھال کر ایک امیر گھرانے کا لڑکا پسند کیا تھا۔ لڑکے کے باپ امرت سر میں لاکھوں کی

جائداد بنائی تھی۔ انہوں نے لڑکی کے لئے نہایت اچھا بر ڈھونڈا تھا۔ کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی کی اصلی مسرت چند شعروں پر نہیں بلکہ ہلدی کی بیشمار گانٹھوں پر قائم ہے۔ عورتوں کا کام پڑھنا لکھنا اور ناچنا نہیں، بچے جننا اور برتن مانجھنا ہے۔ زندگی کا اصلی لطف برتن صاف کرنے میں ہے، شعر کہنے میں نہیں خیالی دنیا عملی دنیا سے بہت الگ ہے۔ بے وقوف پرکاش وتی کے آنسوؤں کو دیکھ کر بہت غصہ آیا کہنے لگا۔ لاکھوں کی جائداد کی مالک بن رہی ہو۔ اور اب یوں ٹسوے بہا رہی ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔"

پرکاش وتی روتے روتے ہنس پڑی۔ کہنے لگی: "مجھے اس طرح تنگ کرنے میں تمہیں کیا فائدہ ہے۔؟ جاؤ ہٹو۔"

پرکاش نے کہا۔ "ہم نہیں ہٹیں گے، کوئی بات ہے بھلا یہ بھی۔؟ یوں آنسو بہا کر ہم پر رعب جمایا جا رہا ہے۔ اے ہلدی بیچنے والے کی ہونیوالی بیوی، ہم تم سے ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں جواب دو گی۔؟"

پرکاش نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "دیکھو جب تک تم خود نہ اڑو۔ اپنے پر نہ پھڑ پھڑاؤ۔ دنیا میں تمہیں اڑنے نہ دے گی۔"

پرکاش وتی نے کہا۔ "کوئی پر پھڑ پھڑائے بھی تو اڑ کر کہاں جائے۔؟ یہ بھی تم نے کبھی سوچا ہے۔؟"

اس کی آواز بھر بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

اور پرکاش چپ ہو گیا۔ لاجواب ہو گیا۔ ہنسی ہنسی میں اس نے پرکاش وتی کے دل کے درد کو پا لیا تھا۔ اسے ہمدردی بھی تھی۔ لیکن یہ بھی خیال تھا کہ اگر پرکاش وتی چاہتی تو اپنی مرضی کا بر ڈھونڈھ سکتی تھی، یا اپنے ماں باپ کو مجبور کر سکتی تھی۔ لیکن پرکاش وتی کے دو بے ساختہ فقروں نے اسے احساس دلا دیا کہ یہ خیال کتنا غلط تھا۔ اور عملی طور پر کس قدر ناممکن، اندھی سماج کے قفس میں پھڑپھڑانا بے سود ہے۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ مرد ہلدی بیچے اور عورت ہلدی بیچنے والے کی وفادار بیوی بن کر برتن صاف کرے۔ اس نے پرکاش وتی کے آنسو پونچھ ڈالے اور پرکاش وتی نے اس سے کہا کہ اگر تم شادی میں نہ آتے۔ تو شاید میں مر ہی جاتی۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ اس خوفناک شادی کے تمام مراحل سے ایک انجان اور شرمیلی دلہن کی طرح گزر جاؤں اب تمہارے ہوتے ہوئے میری ہمت بندھ جائیگی۔

پرکاش نے کہا۔ "تم تو جھوٹ بھی اس طرح بولتی ہو کہ بالکل سچ معلوم ہوتا ہے۔" پھر ہنس کر کہنے لگا۔ "آخر ایک دوکاندار کی بیوی ہونا۔!"

پرکاش وتی نے تیوریاں چڑھائیں اور کچھ کہنے ہی کو تھی کہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا اندر کمرے میں داخل ہوا کہنے لگا۔ "پرکاش جی کو سائیں جے تا جی بلاتے ہیں۔"

پرکاش نے پوچھا۔ "سائیں جی کون ہیں؟"

پرکاش وتی بولی۔ "یہ لڑکا اپنے آپ کو سائیں جی کہتا ہے۔ پاگل ہے۔ اس کا باپ پنواری ہے۔"

پرکاش نے پوچھا۔ "سائیں جی کے تایا جی کہاں ہیں۔؟"

لڑکے نے کہا۔ "باہر بیٹھک میں بیر کے پاس بیٹھے ہیں۔"

پرکاش نے کہا۔ "اچھا تو میں چلتا ہوں۔ اب تم بھی سہیلیوں میں بیٹھو، ہنسو، کھیلو، آخر یہ شادی ہے تمہاری۔"

پرکاش وتی پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگی۔

✽

باہر بیٹھک میں بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے، اور بیر نے پرکاش کا تعارف سب سے کرایا۔ چونی لال، قصبے بھر میں ہاکی کا زبردست کھلاڑی اور بیر کا بچپن کا دوست لالہ ستیا رام پٹواری، لمبا، دُبلا، پتلا، ناک پر عینک اور عینک کے پیچھے زود اداس سی آنکھیں، ایسی آنکھیں جو اکثر پٹواریوں کے پاس نہیں ہوتیں۔ خوش رو، متین برجیندر، بیر کا بہنوئی جو ڈاک خانے میں ایک ممتاز عہدے پر ملازم تھا، ہر وقت ہنسنے والا لبیا سنگھ قصبے کے سیٹھ کا لڑکا، دھن نیال جس کا باپ بمبئی کے ایک زبردست تاجر کا منیم تھا۔ اور رام لال، منگت رائے، سیجر رام، ڈھیرو اور گاؤں کے وہ تمام معزز آدمی جن کے بغیر کوئی شادی کامیاب نہیں ہو سکتی جن کی صورتیں منحوس ہوتی ہیں، کپڑے غلیظ اور داڑھیاں اُلجھی ہوئی لیکن جن کا دل سونے کا ہوتا ہے اور ہاتھ لوہے کی طرح مضبوط

یہ وہ نیک دل فرشتے ہوتے ہیں جو تین چار سو آدمیوں کی بارات کو چٹکیوں سے بھگا دیتے ہیں۔ اور جب گھی کا میں پوریاں تلنے بیٹھتے ہیں تو گھنٹوں بغیر حقے کی مدد کے تلتے رہتے ہیں، اور جب کڑاہیاں مانجھنے پہ آجائیں تو بڑے بڑے جغادری جمعداروں کو مات کر دیتے ہیں یہ آدمی غریب ہوتے ہیں۔ لیکن شادی کے دنوں میں ان کی سماجی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے ان دنوں زیادہ چاچا، ماموں، تایا کے معزز لقب سے پکارے جاتے ہیں۔ اور جب عورتیں گھنٹوں جھگڑنے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہ کر سکیں۔ کہ جب دولہا آئے تو دروازہ کی چوکھٹ پر سرسوں کا تیل ڈالنا چاہیے یا زعفرانی گھی تو چاچا پھیرو دیکھو ماموں پانی کے گلاس میں چند چاول اور زعفران کے تنکے ڈال کر اسے گندھا دیجئے۔ بس یہ۔ نہ تیل کا نقصان ہوا اور نہ گھی خراب ہوا، اور رسم بھی پوری ہو گئی۔ انہی باتوں سے تو یہ لوگ شادی بیاہ کے دنوں میں پوجے جاتے ہیں۔

ہرچندر نے، جو ہمارے بیرکی بڑی بہن بیاہی ہوئی تھی، پرکاش سے پوچھا۔

"آپ چاچا جی لاہور میں کیا کرتے ہیں۔"

"بڑا پاجی۔" پرکاش نے سوچا۔ یہ صاحب مجھ سے کئی سال بڑے ہوں گے۔ میں پھر بھی مجھے بڑا بھائی کہہ کر پکارنے پہ مصر ہیں۔ اور ایک انہی پر کیا موقوف ہے ادھر پچھلے تین گھنٹوں تمام واقعات اور وہ تمام شادیاں اور دیگر تقاریب یاد آئیں۔ جہاں بہت سے نئے ملنے والوں نے اسے جھٹ بڑا بھائی بنا لیا تھا۔ شاید یہ اس کی گنجی چندیا کا اثر تھا یا اس کے چہرے کی متانت کا جس سے ادھیڑ پن ٹپکتا تھا۔ لیکن اسے یہ

اس کا کیا قصور تھا۔ پرانے واقعات کی یاد بہت تلخ تھی۔ جس نے اسے تبل از وقت معمر کر دیا تھا۔ لیکن موجودہ زندگی بھی چنداں خوشگوار نہ تھی، کنبے کا پیٹ بھرنے اور روزی کمانے کے بکھیڑوں نے اس کی روح کو کچل دیا تھا۔ اور اس کے ضمیر اور اس کے اخلاق کو نیم مردہ کر دیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی وہ سوئی ہوئی خلش بیدار ہو جاتی تھی اور پھر اس کی ٹیس سے متاثر ہو کر اس کا جی چاہتا کہ وہ کپڑے پھاڑ کر نکل جائے۔ اور چیخ چیخ کر تقدیر اور سماج کے وحشیانہ مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے۔ لیکن یہ طوفان ہمیشہ دل کی چہار دیواری تک ہی محدود رہتا۔ اس کا اثر صرف اس کی اپنی ذات پر ہی تھا اور جس طرح طوفان ساحل کی دیوار کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس کی اندرونی زندگی بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ اس کی جوانی راکھ کا ایک ڈھیر اور روح ایک لتھڑی ہوئی لاش۔ اس لئے اب جب کوئی اسے بھا پا جی کہہ دیتا تو اسے چنداں حیرت نہ ہوتی۔ اور وہ اپنے دل کی اداسی کو اپنے لبوں کی مسکراہٹ میں چھپا لیتا اور اپنے مخاطب کی شوخ کلامی کی داد دیتا۔ جس نے ایک لمحے میں اسے بڑا بھائی کہہ کر اپنے آپ کو جوان بنا لیا تھا۔

پرکاش نے کہا۔ "میں کوآپریٹو بنک میں کلرک ہوں۔"

"کیا تنخواہ ملتی ہے۔؟"

"پچھتر روپے۔"

"پچھتر روپے۔!" پٹواری نے کہا۔ "تب تو مزے میں ہیں آپ بھائی صاحب۔"

"جی ۔ آپ کی عنایت ہے ۔"

بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔ گاؤں کے سیٹھ کا لڑکا ہر وقت ہنستا رہتا تھا۔ پرکاش کو اس کا ہنستا رہنا برا لگا۔ لیکن اس ہنسنے میں کوئی برائی نہ تھی۔ یہ زندگی اور بے فکری کا ایک مسلسل قہقہہ تھا۔ جس میں پرکاش کی یرقانی نگاہوں کو طنز کے تیر و نشتر چھپے ہوئے نظر آئے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد بوٹا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پٹواری جی کوئی گیت سنایئے۔"

پرکاش نے پٹواری کی اداس آنکھیں سے پوچھا۔ "کیوں کیا تمہیں گیت بھی یاد ہیں۔"

پٹواری نے بوٹا سنگھ سے کہا۔ "بھئی، اس وقت جی نہیں چاہتا۔"

پرکاش نے پٹواری کی اداس آنکھوں کی اداسی کو دیکھ کر کہا۔ "بے شک تمہیں گونا آتا ہے۔ تمہیں کئی گیت یاد ہوں گے کئی گیت، جو تمہاری اداسی نے خود بنائے جو تمہارے دل کے تاروں سے نکلے اور جو کئی جنموں تک تمہاری روح کے ویرانے میں گونجتے رہ گئے۔ لیکن کیا ہوا تمہیں۔ یہ اداسی تم نے کہاں سے پائی ۔ ؟"

پٹواری نے جیسے پرکاش کے دل کی بات سن لی کہنے لگا۔ "بھئی آج تو جی نہیں چاہتا۔ سائیں کی حالت ہر روز بگڑ جاتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

چاچا پھیرو نے حقّہ آگے کر کے کہا۔ "حقّہ پیجئے۔ لالہ جی۔ ذرا دیکھئے اس وقت تو خوب چل رہا ہے۔"

پرکاش نے پوچھا۔ "لالہ جی۔ سائیں آپ کا لڑکا ہے۔ بڑا عجیب سا لڑکا ہے۔"

"عجیب۔ ؟" پٹواری نے آہستہ سے کہا۔ "وہ تو پاگل ہے۔ جی۔ کیا بتاؤں۔ اس

پر اکثر جنون کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اور اول جلول بکنے لگتا ہے۔ ہمارے ہاں مسلمان تو اسے فقیر سمجھتے ہیں۔ اور اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو پتھر کی لکیر اور ہندو کی سب عورتیں سمجھتی ہیں کہ وہ کوئی بڑا عامل ہے۔ اور ہر مرض کا علاج جانتا ہے اور شیطان بھی جیسے چٹکی اٹھا کر دیتا ہے اللہ کی مرضی سے وہ بالکل بھلا چنگا ہو جاتا ہے۔"

"سچ مچ۔!"

چودھرائن نے کہا۔ "ہاں میرا چھوٹا بھائی دس روز بخار میں مبتلا رہا حکیم صاحب نے بہتیری کوشش کی لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ یہ سائیں گلی میں کھیل رہا تھا۔ میں اسے بلا لایا۔ اس نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "بھائی اچھا ہو جائے گا۔ بھائی ٹھیک ہو جائے گا۔ بھائی ٹھیک ہو جائے گا کوئی فکر نہیں۔" اور دوسرے دن میرے چھوٹے بھائی کا بخار اتر گیا۔"

"کمال ہے۔!" پرکاش نے حیرانی سے کہا۔

پٹواری نے کہا۔ "یہ مسلمانوں کے گھروں میں جا کر سب کچھ کھا پی آتا ہے۔ اسے ان باتوں کی بالکل تمیز نہیں۔ پنڈت صاحب اس سے بہت محبت کرتے ہیں جب ڈپٹی صاحب کا لڑکا قتل ہونے کو تھا۔ اس نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔"

"بڑے تعجب کی بات ہے۔!" پرکاش نے کہا۔

پٹواری بولا۔ "اس سے پہلے میرے تین لڑکے تھے۔ وہ سب مر گئے۔ اب یہی بچہ میری آنکھوں کا نور ہے۔ اب میں کسی سے رشوت بھی نہیں لیتا۔ کسی کو بے جا تنگ نہیں کرتا لیکن

جگوان کو نہ جانے کیا منظور ہے۔ پچھلے سال اس کا ایک چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میرا بھائی آئے گا۔ پھر اس لڑکے کی پیدائش کے چند ماہ بعد اس نے ایک دن اپنی ماں سے کہا۔ کہ آج میرے بھائی کی اچھی طرح حفاظت کرنا۔ اسے باہر لیکر نہ پھرنا۔ اور نہ اسے کوٹھے پر لیجانا۔ اس کی ماں نے ایسا ہی کیا۔

دھن سیال نے بات پوری کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں، اسی دن دو چھوٹے لڑکے کوٹھوں پر سے گر کر مر گئے۔"

پٹواری نے کہا۔ "اور وہ چھوٹا بچہ بیمار ہوا تو ہم نے سائیں سے کئی بار پوچھا لیکن اس کمبخت نے زبان تک نہ کھولی۔ آخری رات، وہ رات مجھے اچھی طرح یاد ہے، سائیں کی ماں سو گئی تھی۔ چھوٹا بچہ بھی اس کی گود میں لیٹا سو رہا تھا۔ اور سائیں بھی اپنی چھوٹی چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ اس رات مجھے نہ جانے کیوں نیند نہ آئی اور میں بستر پہ پڑا بہت دیر تک گنگناتا رہا۔

ہزار دکیندا اا چا ......

منّو نہ پھر دل جو گیا۔

تیرا لبھنا نہیں لعل گواچا

منّو نہ پھر دل جو گیا۔

یکایک سائیں نے چیخ ماری اور اٹھ کر کہنے لگا "لے گئے، لے گئے میرے بھائی کو لے گئے۔" میں گھبرا کر بستر کی طرف گیا۔ جہاں بچہ سویا پڑا تھا۔ ہاتھ لگا کر دیکھا۔ ہائے، میرا

بچہ مردہ اور بے جان اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ بے خبر سوئی پڑی تھی اور اس کے لال کو رات کے اندھیارے میں یمراج کے دوت اٹھا کر لے گئے تھے۔"

۴

شام کے وقت تیر کا بہنوئی برجندر اور پرکاش بیاس کے کنارے سیر کرنے گئے ریتیلے ٹیلوں پر کہیں کہیں کیکر کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ اور ان سے نیچے اتر کر کھیت تھے۔ لیکن فصل کاٹی جا چکی تھی، اس لئے بالکل زرد کھیے سوکھے دکھائی دے رہے تھے۔ دریا کے کنارے کہیں کہیں سرکنڈے اگ رہے تھے اور کہیں کہیں گرد سے کیلے بیروں کی جھاڑیاں مرغابیوں کا ایک جھنڈ مغرب کی طرف پر پھیلائے جا رہا تھا۔ کنارے پر دو تین چھوٹے بندھے ہوئے تھے۔ ہوا رکی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور فضا میں سناٹا تھا۔ کہیں کہیں کوئی پرندہ چیخ اٹھتا، اور دریا کی سطح پر دور ایک کشتی چلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ پرکاش نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اور حدِ نظر پر اس کی نگاہیں بڑھتے ہوئے اندھیرے میں جا گئیں۔ اس منظر میں کہیں بھی کوئی ایسا نقطہ نہ تھا جسے وہ دلکش یا جاذبِ نظر کہہ سکتا۔ ایک عجیب سی غمناکی ایک عجیب سی ویرانی تھی جسے محسوس کر کے اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ پرکاش نے برجندر کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ خوش نصیب آدمی اپنے گرد و نواح سے بے خبر اور بے نیاز مزے سے دانتن کئے جا رہا تھا۔ وہ باتیں کرتے کرتے کہنے لگا "بھائی صاحب آپ ذرا تیر کو

تو سمجھا نہیں تا۔!"

"کیوں۔ کیا بات ہے۔؟"

"بات یہ ہے کہ لڑکا یوں تو سمجھدار ہے۔ کماؤ ہے۔ لیکن روپے کی قدر نہیں جانتا۔"

"وہ کس طرح میرے خیال میں تو......"

برجیندر نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ نہیں جانتے۔ اول تو وہ دوستوں کو بہت کھلاتا پلاتا ہے۔ اور پھر اس شادی میں تو میں نے دیکھا ہے۔ وہ اندھا دھند روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ جہاں دو روپے میں کام ہو سکتا ہے۔ وہاں یہ دس روپے خرچ کر دیتا ہے۔ بھلا اس طرح بھی کبھی گھر کے کام چلتے ہیں۔ اور پھر جب سے یہ چین سے واپس آیا ہے۔ ہر وقت گھر والوں کو جھڑکیاں دیتا رہتا ہے۔ اور کسی بزرگ کو کچھ نہیں سمجھتا۔ یہ بات اچھی نہیں۔ بیا ہوا اگر وہ پچاس سو روپیہ مہینہ کما لیتا ہے آخر اس کے ماں باپ ہی نے تو اسے پڑھایا ہے۔ اگر انہیں کا کہا نہ مانے، تو اس سے بڑھ کر احسان فراموش اور کون ہوگا۔؟"

"بے شک! بے شک۔!" پرکاش نے اپنی ناک کھجلاتے ہوئے کہا۔

"اب شادی کے معاملے ہی کو لیجئے۔ پرکاش وتی کی شادی نہیں بلکہ اس کی اپنی۔ اس کی ماں چاہتی ہے کہ وہ اب اس کی منگنی کر دے۔ اور اس سال بیاہ بھی دے۔ لیکن اسے دیکھو یہ مانتا ہی نہیں۔ لالہ لبا کھامل کے ہاں سے ناطہ ملتا ہے۔ لڑکی سیانی ہے۔ گھر کے کام کاج سے واقف سوشیل سمجھدار، سینا پرونا جانتی ہے۔ خط پڑھ لیتی ہے۔ ماں باپ، بھائی بہنیں کسی میں کوئی نقص نہیں شریف گھرانا ہے۔ کھرتی گھر ہے۔ اور

پرانا خاندان ہے۔ امیر آدمی ہیں۔"

"تو یہ مانتا کیوں نہیں۔؟"

"کہتا ہے۔ لڑکی بھنگنی ہے۔ سانولا رنگ ہے۔ آواز بھاری ہے۔ اور اپنی طرف بگاڑ ہی نہیں۔ بڑے یوسف ثانی بنے پھرتے ہیں۔ کہتا ہے میں شہر کی لڑکی لاؤں گا۔ جو دسویں پاس ہو اور شعر و شاعری سے مس رکھتی ہو۔ سینما کی تصویروں پر بات چیت کر سکے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ بڑا شریف لڑکا تھا۔ اسے خبر نہیں کہ آج کل زمانہ کیسا ہے۔ شریف گھرانے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ اب پرکاش وتی کو دیکھو گیارہویں پاس کر کے بھی کیا بنا، تعلیم عورتوں کے کس کام کی۔ لڑکی تو وہی ہے جو گھر کا کام آج اچھی طرح جانے۔ اب ہم اسے کسی بے کار گریجویٹ کے پلے باندھ دیتے تو بیچاری کی زندگی تلخ ہو جاتی۔ اس وقت تو اسے ان باتوں کی سمجھ نہیں لیکن بعد میں ہمیں دعائیں دے گی۔ پرکاش وتی تو خیر ایک لڑکی ہے۔ وہ ہمارے کہنے سے باہر نہیں جا سکتی۔ لیکن اب بیر کو کون سمجھائے۔ میں نے سوچا، بیر آپ کا کہا مانتا ہے۔ آپ سے کہوں گا۔ آپ اسے سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لے آئیں تاکہ گھر برباد نہ ہو۔"

اور پرکاش نے کہا وہ اسے ضرور سمجھانے کی کوشش کریگا۔ لیکن یہ ایک ذرا مشکل سی بات ہو گی۔ کیونکہ شادی زندگی کا محور ہے، اور پھر بیر تو شنگھائی کے کا برے (CABRET) بھی دیکھ چکا ہے۔ اور شاید اسے قرونِ وسطیٰ کی قسم کی شادی پسند نہ آئے۔ لیکن ہرچند نے کہا۔ "نہیں۔ آپ ضرور کوشش کریں۔ میری خاطر سے۔"

اور پرکاش نے کہا۔ "اچھا میں آپکی خاطر سے ضرور کوشش کروں گا۔ لیکن مجھے امید بہت کم ہے۔" برجیندر نے کہا۔ "جی نہیں۔ یہ آپ کیا کہتے ہیں۔؟ آپ اگر چاہیں تو اسے سمجھا سکتے ہیں۔" بہت دیر تک اسی طرح کی بے معنی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ صرف برجیندر رہ رہ کر کبھی کبھی زور سے تھوک دیتا۔ دریا کی سطح پر چلتی ہوئی کشتی اب بالکل کنارے کے قریب آگئی تھی۔ اس میں چند کسان بیٹھے تھے جو پورب کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے بچے اور بیویاں اور لڑکیاں بھی ساتھ تھیں وہ نہایت خاموشی سے بیٹھے تھے۔ بچے سہمے ہوئے تھے۔ عورتوں کے چہرے پژمردہ تھے۔ اور کسانوں کی آنکھوں میں چمک نہ تھی۔ اور ان کی نگاہوں کی اوٹ میں ناامیدی جھانک رہی تھی۔ پرکاش نے سوچا، یہ میرا خیال ہی ہے۔ میں ہر جگہ اور ہر مقام پر یونہی غم کی تلاش کرتا رہتا ہوں۔ ورنہ دراصل یہ معمولی سے چہرے ہیں۔ عام کسانوں کے۔ ان کے دلوں میں طمانیت ہے۔ صبر ہے۔ یقین ہے۔ شاید یہ رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کا دھوکہ ہے کہ مجھے ان کی صورتوں میں یاس کی جھلک نظر آتی ہے۔ شاید یہ میرے ہی دل کا عکس ہے میری روح کا پرتو ہے۔ شام کے سناٹے کی بھیگی فضا اور سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا کا اثر ہے۔

کشتی سے اتر کر کسانوں اور ملاحوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ ملاح اونچی اونچی آوازوں میں گالیاں دینے لگے۔ پرکاش اور برجیندر اٹھ کر اس گروہ کے قریب چلے گئے۔

برجیندر نے پوچھا۔ "کیوں جھگڑتے ہو بھئی! کیا بات ہے۔؟"

ایک ملاح نے کہا۔ "شاہ جی۔ بات یہ ہے کہ ہم ان پوربیوں کو بیاس پار لائے ہیں۔

دوسرے کنارے پر صبح کے بیٹھے تھے اور کوئی انہیں پار نہیں اتار رہا تھا۔ کیونکہ یہ پیسے پورے نہیں دیتے تھے۔ کہنے لگے ہم حصار کے قحط کے مارے ہوئے غریب کسان ہیں۔ ہمارے ڈھور ڈنگر مر گئے ہیں۔ ہماری کھیتیاں اجڑ گئی ہیں۔ ہم پر رحم کرو۔ ہمیں بیاس پار کر دو۔ ہم نے کہا۔ اچھا تو سب آدمی ایک ایک پیسہ دیدو۔ ہم تمہیں بیاس پار لے چلتے ہیں۔ اب یہاں آکر یہ کل پندرہ پیسے دیتے ہیں اور یہ آدمی ہیں پچیس ــــ آپ خود ہی گن لیجئے۔"

کسانوں نے کہا۔ "ہم غریب ہیں۔ ہم قحط کے مارے ہوئے ہیں۔ ہم پر دیا کرو۔" بچے رونے لگے۔ عورتوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

ایک ملاح نے کہا۔ "اور ہم کہاں سے کھائیں۔؟ سارے دن میں بیاس پار کتنے آدمی اترتے ہیں۔؟ ان چند پیسوں میں مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ ہم نے تمہیں دو دو پیسے فی آدمی چھوڑ دیئے۔ اب تم ایک ایک پیسہ بھی نہیں دیتے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔؟"

پرکاش نے دس پیسے ملاح کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

ایک بوڑھے کسان نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ یہ میرا کنبہ ہے۔ میں بھی کبھی مال مویشی والا تھا۔ میرا گھر کچی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ ابھی کل تک میری کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ میرے دوارے پر بھکاری بھیک مانگتے تھے۔ میری بہو بیٹیاں اور بیٹیاں آنگن میں گیت گاتی تھیں۔ آج وہ بین کر رہی ہیں۔ بھگوان! میں نے

ایسی مینا کبھی نہ دیکھی تھی۔ اب در بدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔ پیٹ بھر کھانے کو روٹی نہیں ہے۔ ایسا قحط میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ جگوان! یہ کن کھوٹے کرموں کی سزا ہے۔ ؟"

برجندر نے کہا۔ "تم ایک دو آدمی ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں آٹا دال اور نون سب کچھ دیں گے۔"

بوڑھا کسان بولا۔ "پرماتما تمہارا بھلا کرے۔!"

ایک بوڑھی عورت بولی۔ "اری لڑیا! جا سرکنڈے، گھاس پھوس اور لکڑیاں اکٹھی کر لے۔ اری نیو! لحاف اور چٹائیاں اور برتن بھوسے سے اتار کر ادھر لے آ۔ ارے مادھو اکمبخت کدھر بھاگ گیا تو......"

لڑیا اٹھی اور سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف چلی۔ وہ ایک سانولے رنگ کی جوان عورت تھی۔ پرکاش نے دیکھا اس کی چولی اور لہنگا جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا۔ اور وہ چلتے چلتے اپنی جوانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ لیکن غریبی میں نہ تو غریبی ہی چھپتی ہے اور نہ جوانی.......

دریا سے واپس آکر پتہ چلا کہ بارات دوسرے دن شام کو سری پور پہنچ جائے گی۔ لڑکے والوں کا نائی آیا تھا۔ اور اب وہ ایک بڑی گلابی رنگ کی پگڑی باندھے آنگن میں لکڑی کے تخت پوش پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ اس خبر نے گھر والوں کو چونکا دیا۔ برات آئے گی یہ بھی سب جانتے تھے۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی دل میں ایک واہمہ سا تھا۔

لیکن اب واہمہ دور ہو گیا اور اب اُس کی جگہ ایک اضطراب، ایک عجیب قسم کی بے چینی اور عجلت نے لے لی۔ چاچا پیرو جو قصبے میں حلوائی کی دکان کرتے تھے۔ اور پچیس برس گنڈ جانے پر بھی مجرد تھے۔ دوڑتے ہوئے لاریوں کے اڈے پر گئے۔ تاکہ کل کے لئے بٹالے سے برف منگوانے کا انتظام کریں۔ سنگت رائے اور بر جیندر کو برات گھر میں صفائی کروانے، برات گھر سجانے اور براتیوں کے لئے چار پائیاں بچھوانے کا کام سپرد ہوا گھر میں آئی ہوئی عورتوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اور ساڑھیوں اور قمیصوں کے رنگ شوخ تر ہوتے گئے۔ بیر اپنے باپ کی چاندی کے دستے والی چھڑی لے کر ادھر اُدھر گھومنے اور جھیوروں کو چستی سے کام کرنے کی ہدایت کرنے لگا۔

بیٹھک میں اب صرف پرکاش اور چونی لال اور لوٹا سنگھ رہ گئے۔ پرکاش کھڑکی سے ان عورتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جو گھر کے بڑے دروازے سے اندر آ رہی تھیں۔ یا باہر جا رہی تھیں۔ رنگین لباس سرسراتے ہوئے قمیصیں جن پر سنہری پھول بوٹے بنائے گئے تھے۔ چنریاں جن پر مقیش کے لہریئے تھے۔ پھر کبھی کبھی ان میں کوئی خوبصورت چہرہ بھی نظر آ جاتا۔ یوں ہی قصباتی سا حُسن، جس میں رعنائی اور موہنی کی بجائے جوانی اور الھڑ پن کی آمیزش زیادہ ہوتی۔ یکایک چونی لال اور لوٹا سنگھ نے ایک ساتھ دبی سی چیخ ماری۔ سامنے دو لڑکیاں جا رہی تھیں۔ نینوں کے بادامی دوپٹوں میں ان کی چوٹیاں کالی ناگنوں کی طرح بل کھائی ہوئی تھیں اور ایک کی گردن کے خم میں مدورا کے مندر لٹکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پرکاش کا چہرہ شرم سے سرخ

ہوگیا۔ اسے یہ خیال نہیں آرہا تھا، کہ کوئی اس کی جبنوں کو دیکھ کر خوشی سے چیخیں مار سکتا ہے۔ سوشیلا اور لیلا گلی میں چلتے چلتے ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ اب مخالف سمت سے دو اور نوجوان اور حسین لڑکیاں آرہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر بوٹا سنگھ کے منہ سے بے اختیار ایک دبی سی چیخ نکل گئی۔ ان دو نوجوان لڑکیوں میں سے ایک تو وہی دوشیزہ تھی، جس نے بیر کو اور پرکاش کو لسی پلائی تھی۔

پرکاش نے پوچھا۔ "وہ کون ہے۔؟"

"وہ کون۔؟" چونی لال نے پوچھا۔

"وہ جو آسمانی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے شرما سی رہی ہے اور مسکرا سی رہی ہے اور........"

چونی لال نے کہا۔ "وہ!........ وہ مس اوورسیر ہے۔" اور کہکر چونی لال اور بوٹا سنگھ دونوں ہنسنے لگے۔

"مس اوورسیر۔!"

"ہاں، ہاں،" بوٹا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس کا باپ نہر کے محکمے میں اوورسیر ہے نا۔"

چونی لال نے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھ کر رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ اوورسیر کی تبدیلی جالندھر ہوگئی ہے اور اب وہ دو تین دن میں یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"سچ مچ۔؟"

"ہاں۔ مجھے آج ہی پتہ چلا ہے، ایک بڑے معتبر آدمی سے۔ لیکن یہ بات کسی کو بتانا

نہیں۔ اگر اس نے سن لیا تو تمہارے چادے پر قیامت گذر جائے گی۔"

"نہیں، نہیں۔۔۔۔۔۔ آہ بے چارہ۔" اتنا کہہ کر بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔ چونی لال بھی
اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ پرکاش نے سوچا، یہ لڑکے کیسے بدمذاق اور بے تربیت ہیں
بالکل دیہاتی۔ وہ بیٹھک سے اٹھ کر گھر کے آنگن میں دری بچھ گئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ
گیس لیمپ لٹک گیا تھا۔ اور کمسن لڑکیوں نے ابھی سے ڈھولک بجانی شروع کر دی تھی۔

کتھے گیوں! پردیسیا دے!

ٹمک ٹمک ٹِک ٹِک بجتی ہوئی ڈھولک پر ایک لڑکی پتھر کے ایک ٹکڑے سے
تال دے رہی تھی، پرکاش نے سوچا" نادانوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ پردیسی
سے پیار کیوں۔ ؟ اس نے دیس دیس کے گیت سنے تھے۔ بلوریں چشموں کے کنارے
نیلی نیلی آنکھوں والی چرواہیوں کے گیت، اور ڈرائنگ روم میں ارغنوں پر گیت،
جہاں گلدان میں لمبی لمبی ڈنڈیوں پر نرگس کے پھول جھکے ہوئے تھے۔ گیت جو دوپہر کی تپتی
ہوئی اداسی میں گائے گئے۔ جب فضا میں پیپل کے پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور آنکھوں
میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ گیت ۔۔۔۔۔۔۔ لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ عورت
کے ہر نغمہ میں پردیسی کے لئے پیار موجود تھا۔ یہ پیار کبھی تو مدھم سروں میں لرزنے لگتا
اور کبھی اس کی گویائی کی حس اتنی شدید ہو جاتی کہ وہ نغمہ کے الجھاؤ میں ایک
زخمی پرندے کی طرح چیخ اٹھتا، لیکن پردیسی کے لئے اس قدر تڑپ کیوں۔ ؟ پرکاش
نے پوچھا اور اسے خیال آیا کہ یہ نغمہ انسان کی فطرت کا نغمہ تھا۔ وہی نغمہ جس نے دور کی

مس اودر سیئر کو دیکھا جو ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے۔ بیر کا چہرہ سفید تھا اور مس اودر سیئر کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ پرکاش جلد جلد زینے پر چڑھ گیا۔ بیر نے آہستہ سے کہا۔ بھائی جان میں بھی اوپر آرہا ہوں۔ ابھی...... دوسری منزل میں ایک بڑے کمرے میں بہت سی لڑکیاں پرکاش وتی کو گھیرے ہوئے تھیں۔ وہ دبے دبے قہقہوں اور میٹھی میٹھی سرگوشیوں کے ساتھ پرکاش وتی کو دولہا بھائی کی آمد کے قصے سنا کر چھیڑ رہی تھیں اور اپنی دبی ہوئی جنسی خواہشوں کی ناکام تکمیل کر رہی تھیں۔ پرکاش چند کو کمرے میں آتے دیکھ کر ساری مجلس درہم برہم ہو گئی۔ کئی لڑکیاں کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اور ہنسنے کے باوجود بھی شرماتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اوروں نے جرات سے کام لیکر اسے اپنے نسوانی مزاج کا نشانہ بنانا چاہا۔ اتنے میں بیر آگیا اور آکر ایک کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر چپ چاپ لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ سپید اور ستا ہوا تھا اور اس کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید اسے ابھی غش آنے کو ہے۔ بہت سی لڑکیوں نے دیکھا اور اندازہ لگایا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے اور وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ پرکاش وتی وہیں جلد جلد بیر کے پاس گئے۔ پرکاش وتی نے اپنا ہاتھ بیر کے ماتھے پر رکھا۔ کہنے لگی۔ "ماتھا گرم ہے۔"

پرکاش نے پوچھا۔ "کیا بات ہے بیر؟"

بیر نے رکتے رکتے کہا۔ "...... کوئی بات نہیں۔ جی دم گھٹا جا رہا ہے۔"

پرکاش نے کہا۔ "پانی پانی۔"

پرکاش وتی نے گھبرا کر کہا۔ "پانی پانی۔"

باہر کی لڑکیوں نے چیخ کر کہا۔ "پانی پانی۔"

سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ پانی، پانی، بیر کی ماں دوڑتی ہوئی اندر آئی اور ایک چھوٹے سے گلاس میں پانی اور گلاب ملا کر لائی۔ بیر نے تھوڑا پانی پیا اور کہا میں اب اچھا ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ کوئی ماتھا دبانے لگا۔ کسی نے ہاتھ پکڑ لئے۔ کسی نے پاؤں۔ کسی نے کہا کھڑکی بند کردو ہوا لگ جائے گی۔ کسی نے کہا کھڑکی کھول دو، ہوا لگنے دو۔ ایک پھوپھی جان بولیں۔ اسے دودھ میں گرم گھی ملا کر پلاؤ۔ پلایا گیا۔ دوسری پھوپھی جان بولیں۔ "اے ہے۔ کہاں ہے بیر کی ماں۔ او بیر کی ماں۔"

بیر کی ماں بولیں۔ "میں تمہارے پاس ہی تو کھڑی ہوں۔"

"اچھا۔ اچھا۔ جا بھاگ کر نیچے سے بادام روغن لا۔"

بیر کی ماں جلدی سے بادام روغن لانے گئی تو خانہ جاگ گئی۔ اس کے پیچھے دوڑ رہا ... اور ... اور ... میں کہتی ہوں، بیر کی ماں، اس کے تو ہاتھ پاؤں جھنک رہے ہیں۔ بازار سے کوئی چپل منگوا دو تاکہ پیروں پر اچھی طرح مالش کریں اور گرمی پہنچے۔ اسے گرمی ہے۔ اور کچھ نہیں۔" بیر نے بہت انکار کیا کہ اسے گرمی نہیں تھی، محض دم گھٹا جا رہا تھا۔ اور اب وہ بھی نہیں گھٹتا تھا۔ اب اسے آرام تھا سکون کی ضرورت تھی۔ لیکن سب نے اسے آرام سے لیٹے رہنے کو کہا۔ ... بیر نے اچھ

آنکھیں بند کر لیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ شور و غل کرنے، بیر کا سر سہلانے اور اس کے پاؤں اور ہاتھوں پر کالشی کی مالش کرنے کے بعد گھر کی عورتوں کی جان میں جان آئی، اور وہ اسے چارپائی پر آرام سے سویا ہوا چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد فوراً بیر نے آنکھیں کھول کر کہا۔

"ہائے سجا پاجی۔"

پرکاش چند نے مسکرا کر پوچھا۔ "چین کیسا ملک ہے۔؟"

بیر نے کہا۔ "ہائے میں مر جاؤں گا، اب کیا ہوگا۔ یہ ان کی تبدیلی ہو گئی ہے۔"

پرکاش چند نے کہا۔ "سنا ہے شنگھائی میں بہت دل پسند نظارے ہیں اور اینگلو چینی عورتیں۔۔۔۔۔"

بیر نے کہا۔ "بس اس کے بغیر نہیں جی سکتا۔"

پرکاش نے کہا۔ "اور چین کے لوگ چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔"

بیر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "ہائے سجا پاجی۔ ہائے سجا پاجی۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا۔"

پرکاش نے کہا۔ "مجھے سب پتہ ہے۔" اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے کے باہر سیڑھیوں کے قریب کونے میں اس نے ایک لڑکی دیکھی۔ اس نے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کی ناک میں نتھ تھا۔

اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی۔ پرکاش نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس لڑکی نے اپنا چہرہ ساڑھی کے پلو میں چھپالیا۔ اور دیوار سے لگی لگی سسکیاں لینے لگی۔

یکایک پرکاش نے سوچا۔ کل پرکاش وتی کی شادی ہے۔

٭

شادی کی رات پرکاش پل بھر کے لئے بھی نہ سو سکا۔ اس نے بیر کی ماں سے کہہ سن کر چارپائی دوسری منزل میں رکھوا لی تھی۔ تاکہ آرام سے سو سکے۔ بیر کی ماں نے نہایت چاؤ سے پوچھا۔ "بیٹا شادی نہیں دیکھو گے۔؟" اور پرکاش نے بیر کی ماں سے کہا کہ وہ دو تین بجے کے قریب جب بیاہ کی رسمیں ادا کی جائیں گی، چارپائی سے اٹھ کر نیچے آنگن میں چلا آئے گا۔ لیکن اسے تو دو تین بجے تک بھی کسی نے سونے نہ دیا کوئی آٹھ بجے کے قریب چونی لال۔ دھن سیال، بوٹا سنگھ ہنستے ہوئے، اور آنگن میں پھرتی ہوئی عورتوں کو تاکتے ہوئے اوپر کی منزل میں آگئے۔

چونی لال نے آتے ہی پرکاش سے کہا۔ "بھائی صاحب آپ نے بہت اچھا کیا آج رات کے لئے چارپائی یہاں رکھوا لی۔ اب یہاں ساری رات بیٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے آنگن کا تماشا دیکھئے۔"

پرکاش نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "میں سونا چاہتا ہوں۔"

بڈھا سنگھ ہنسنے لگا۔ "سونے کے لئے آپ نے اچھی جگہ تلاش نہیں کی۔"

دھن سیال نے کہا۔ "آج ہمارے قصبے میں دو شادیاں ہوئیں۔ آج کا دن بہت مبارک ہے۔"

پرکاش نے پوچھا۔ "دوسری شادی کس کے ہاں ہوئی۔"

دھن سیال نے مسکرا کر کہا۔ "اوہ! آپ کو پتہ ہی نہیں۔؟......ہاں بہت سے لوگوں کو ابھی پتہ نہیں، اور آپ تو نووارد ٹھہرے۔ کل جب پرکاش وتی کی ڈولی جائے گی تو آپ بھی شاید دہلی جانے کے ایک دو دن بعد چلے جائیں گے۔ آپ کو ہمارے قصبے کی شادیوں سے کیا دلچسپی۔؟......لیکن میرے خیال میں آپ کو بتا دینا چاہیئے چاچا چھبرو کی شادی ہوئی ہے۔ چاچا چھبرو کو جانتے ہیں نا۔؟ دبلے پتلے، لمبے قد کے آدمی، وہ جو اس دن بیٹھک میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ میلی سی مونچھیں، کھچڑی سی داڑھی۔ رخساروں پر چھائیاں۔"

"وہ جو بازار میں حلوائی کی دکان کرتے ہیں۔؟" پرکاش نے پوچھا۔

"ہاں، ہاں، وہی جو مٹھائی بنانے کے علاوہ سوڈا واٹر بھی تیار کرتے ہیں تمباکو بھی بیچتے ہیں۔ بیچارے مجرد تھے ابھی تک عمر چالیس برس سے اوپر ہو گئی اور غریبی کی وجہ سے ہماری برادری میں کوئی انہیں رشتہ نہیں دیتا۔"

"یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ چاچا چھبرو کی شادی، آج کا دن واقعی بہت مبارک ہے۔"

چونی لال، دھن سیال اور بوٹا سنگھ ایک ساتھ ہنس پڑے۔" ہم ابھی چاچا چھیرد کو مبارکباد دیکر آرہے ہیں۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے داڑھی منڈوادی ہے۔ اگرچہ مونچھیں بدستور میلی ہیں اور ہونٹوں کے کونوں میں گرتی ہیں۔ انہوں نے ہمیں تازہ مٹھائی کھلائی اور کہنے لگے۔ ابھی اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا اور ہمیں بھی تو اچانک ہی پتہ چل گیا۔"

پرکاش نے پوچھا۔" تمہیں کیسے معلوم ہوا۔؟"

چونی لال بولا۔" ہم دریا پر گئے تھے۔ جہاں حصار کے قحط زدہ لوگ ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ وہاں بہت شور وغل تھا۔ بچے بلک رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں رو رہی تھیں اور ایک بوڑھی عورت اپنے خاوند کو صلواتیں سنا رہی تھی۔ ہائے ری میری لڑیا، میری جوان اور سندر لڑیا۔ پتہ چلا کہ بوڑھے کسان نے وہ بیوقوف بوڑھی عورت اپنے خاوند کو کوس رہی ہے گویا حصار کے قحط کا ذمہ دار اس کا خاوند ہے۔!"

بوٹا سنگھ بولا۔" چاچا چھیرد بہت خوش نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنی دکان میں مٹھائی کے تھالوں کے پیچھے ایک میلی سی چادر لٹکادی ہے تاکہ پرے دہ رہے اور آنے جانے والوں کی نظر نہ پڑے۔"

دھن سیال نے کہا۔" دیکھئے بھائی صاحب، اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے۔ چاچا چھیرد ہم سے ساری عمر بات نہیں کریں گے اور نہ اپنی دکان سے ہمیں مٹھائی کھلائیں گے۔

اور قصبے میں ان کے سوا یہاں کوئی دوسرا حلوائی بھی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔
پھر جے پی لال اور بوٹا سنگھ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے ۔ تھوڑی دیر کے
قیام و طعام کے متعلق انتظامات کی بھی دیکھ بھال کریں بچارے کل یہاں سے رخصت
ہو جائیں گے ..... کہیں انہیں یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ سری پور گئے تھے اور وہاں ان
کی اچھی طرح خاطر مدارات نہیں ہوئی۔"
باراتیوں کو کھانا کھلا کر کوئی دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پرکاش فارغ ہوا اور
آتے ہی چارپائی پہ دراز ہو گیا۔ لیکن نیند کہاں۔ آج شادی کی رات تھی۔ ابھی ابھی
ان لوگوں نے دولہا کا منہ دیکھا تھا اور بیر کی ماں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی بلائیں
لی تھیں۔ "سردارنا" کیا تھا اور چاندی کی چونیاں نچھاور کی تھیں۔ عورتوں نے
سہاگ کے گیت گائے تھے اور کنواری لڑکیوں کی چھاتیاں زور زور سے دھڑکنے لگی
تھیں۔ دولہا کا چہرہ پرکاش نے بھی دیکھا تھا۔ بالکل ہلدی کی گانٹھ کی طرح تھا،
وہی زردی وہی تلخی، وہی سختی اور سہرے کے زریں تاریں اور چمپا کی کلیاں بھی اس کے
رنگ روپ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی تھیں۔ اس کے ساتھ اس کا بڑا بھائی بھی آیا
تھا۔ اس کی ناک چپٹی تھی۔ ہونٹ موٹے، اور رخساروں کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئیں۔ اس کے
ہاتھ میں روپیوں سے بھری ہوئی لال کپڑے کی ایک تھیلی تھی جسے لیکر وہ ادھر ادھر
طرح گھوم رہا تھا۔ جیسے وہ اس سارے قصبے کا مالک ہو اس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔
اس کی آنکھوں میں بھی وہی چالاکی اور بنیا پن تھا جس کی بدولت وہ ہلدی بیچتے بیچتے لکھ پتی

ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے رشتہ دار تھے، جن کے حُلیے ایک دوسرے سے
بہت ملتے تھے کیونکہ ہلدی کی جڑ تو آخر ایک ہی ہوتی ہے۔ گانٹھ چاہے کتنی ہی پتلی یا موٹی
.... "ملنی" کی رسم کے وقت لڑکی والے اور لڑکے والے آپس میں بھینچ بھینچ کر گلے
ملے تھے جیسے ریچھ۔ بھانڈوں اور میراثیوں نے بدھائی کے ترانے گائے تھے۔ اور گداگروں
کے جم غفیر نے گلی کے دونوں طرف ناکہ بندی کر لی تھی، تاکہ جب فریقین کی طرف سے تانبے
کے پیسے نچھاور کئے جائیں تو گلی کی سرخ اینٹوں پر پیٹ رگڑ رگڑ کر اور گندی موریوں
میں ہاتھ ڈال ڈال کر اٹھائیں۔ تو ماجا کے نچھاور ہوتے ہی چھوٹے بڑے گداگر سب ایک
دوسرے پر پل پڑے تھے اور وہ فقیرنی جس کی چھاتیوں سے ایک سوکھا ہوا بچہ لٹک
رہا تھا اور وہ بوڑھی بھکارن جس کے بال بڑ کی شاخوں کی طرح تھے۔ ایک پیسے کے لئے
ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئی تھیں۔ لڑکا چلانے لگا تھا۔ اور میراثی بدھائی کے
گیت گا رہے تھے۔ کیا یہ شادی کی بدھائی تھی۔ یا سماج کے جنازے کا نوحہ یا کسی
نے اپنے گھر کو آگ لگائی تھی، اور اب وہ بھڑکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر خوشی سے
ناچ رہا تھا۔ ..... کوئی پرکاش کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ پرکاش چونک پڑا۔ یہ پرکاش
وتی تھی وہ چپ چاپ آکر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اور وہ دونوں نیچے آنگن میں کام کرتی
ہوئی عورتوں کی طرف دیکھنے لگے۔ آنگن کے بیچ میں کاٹھ کی بیدی کھڑی کی گئی تھی۔
درمیان میں ہون کنڈ تھا۔ کاٹھ کی بیدی مندر کی طرح بنائی گئی۔ ایک چھ پہلو کی عمارت
جو اوپر اٹھ کر ایک تکون کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اسے پھولوں کے لے کے ترن اور

زریں تاروں سے سجایا گیا تھا. بیدی کی چوٹی پر لکڑی کے سبز رنگ کے طوطے لگائے گئے تھے۔ اور آنگن کی دیواروں پر ریشم سے کاڑھی ہوئی سرخ پھلکاریاں لٹکائی گئی تھیں۔ ان پر روم کے قطعے اور گایتری اور دیگر متبرک منتر کاڑھے ہوئے تھے۔ آنگن کے آر پار جھنڈیاں لگائی گئی تھیں اور فرش پر لکیروں والی دریاں بچھائی گئی تھیں۔ پرکاش وتی سے کہا۔ "آج تمہارا بیاہ ہے۔ دیکھو بیدی کتنی خوبصورت بنائی گئی ہے۔ بالکل مندر سے ملتی جلتی ہے، لیکن پجاری ابھی نہیں آئے اور جب پجاری آجائیں گے تو تمہیں نئے کپڑے پہن کر ایک دیوادسی کی طرح اپنے مندر کے دیوتا کو رجھانے کیلئے ناچنا ہوگا، اور تم تو بہت اچھا ناچ سکتی ہو، کیوں۔؟"

پرکاش وتی نے نمناک لہجہ میں کہا۔ "نہیں۔ میں آج ذبح کی جاؤنگی......

خبر نہیں، پڑھا کر، سکھا کر ہر طرح کے عیش و آرام دیکر یہ ماں باپ کیوں ذبح کر ڈالتے ہیں۔ شاید یہ بھی ایک رسم ہوگی۔ لیکن میں سوچتی ہوں، کیا مجھے اسی لئے مہا ودیالہ میں داخل کرایا تھا......... میرا جی بھرا ہوا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ چیخیں مار مار کر روؤں......... مجھے تم سے ہمدردی کی امید تھی اور تم ہو کہ جب سے آئے ہو ہر وقت جی جلاتے رہتے ہو۔"

پرکاش نے کہا۔ "بہن پرکاش وتی جی! جی جلانے کو تو ساری عمر پڑی ہے اب اگر ہنس کر بھی تم اپنے غم کو نہ چھپایا تو تمہاری شاعری کس کام کی۔"

"بھاڑ میں جائے شاعری۔" پرکاش وتی نے جھلا کر کہا۔

"وہ تو اب خود بخود چلی جائے گی۔"

ہر کاشن نے پرکاش وتی کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ اور پھر اس کی ہتھیلی پر انگلی رکھ کر بولا۔ "تمہاری قسمت یہاں لکھی ہے۔ دیکھو یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تم بہت لمبے عرصے تک جیوگی۔ تمہارے دس بچے ہوں گے اور ایک موٹر کار یہ لکیر یہ تمہاری شاعری کی تھی۔ لیکن یہاں آ کر شاعری آبگینہ ہلدی کی ایک گانٹھ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تمہارے خاوند کو تم سے بہت محبت ہوگی یوں بھی تو یہ محبت دس بچوں سے صاف ظاہر ہے، لیکن ان کے علاوہ تمہیں ہر سال نئے بھدے زیور اور ریشمی کپڑوں کے بھاری بھرکم جوڑے سلوا دیا کریگا۔ شادی کے پانچ سال بعد تم اتنی موٹی ہو جاؤ گی۔ کہ خود تمہاری ماں بھی تمہیں پہچان نہیں سکے گی۔ اور ......"

پرکاش وتی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "ہٹو بھی۔ ہر وقت بیہودہ مذاق۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔؟"

ہر کاشن نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے۔ تیر نشانے پر بیٹھا ہے میں جانتا تھا کہ عورت ایک ہلدی بیچنے والے سے شادی کر کے خوش رہ سکتی ہے۔ لیکن اپنے موٹاپے کا ذکر سن کر خائف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

یہ آخری رت جگا تھا۔ بیاہ کی رسمیں دو بجے کے بعد ادا کی جاتی تھیں، اس لئے قصبے کی سب عورتیں اپنے بہترین لباس اور زیور پہن کر آئی تھیں۔ ڈھولک پر انے زدر

سے ہاتھ پڑتا تھا کہ پرکاش کو اس کی دھب وصب سمع نراش معلوم ہونے لگی۔ ہر
ایک عورت اپنے گلے کی پوری قوت سے گا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بیچ
میں زور سے چلا اٹھتے تھے۔ نائینس شربت پلاتی جاتی تھیں اور دوسری منزل پر پرکاش
کے قصبے کے بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکی والوں کے رشتہ دار اکٹھے ہو گئے
تھے۔ اور کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر رت جگے کا نظارہ کر رہے تھے۔ کئی لمبی لمبی
داڑھیوں والے بزرگ بھی آ گئے تھے جو حقّہ پیتے، بار بار کھانستے اور نوجوانوں کو
شرافت کی تلقین کرتے ہوئے اپنی آنکھیں سینکتے جاتے تھے۔ پرکاش نے ان کی
آنکھوں میں دبی ہوئی حسرتیں دیکھیں۔ جو اب اپنی قبروں سے باہر جھانک رہی تھیں۔
جنہوں نے آج تک زندگی کو گناہ سمجھا تھا اور اسے ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنی روح
کی پوری قوت سے دبانے کی کوشش کی تھی۔ ان سے آج زندگی انتقام لے رہی تھی،
کیونکہ حس مر چکی تھی۔ لیکن حرص تیز ہو گئی تھی۔ اور حقّہ پینے والے بزرگ اب اس
راکھ کے ڈھیر کو کرید رہے تھے۔ جہاں زندگی کی ایک چنگاری بھی باقی نہ تھی ــــ
شاید اگر بات یہیں تک رہ جاتی تو پرکاش کو چنداں افسوس نہ ہوتا ــــ لیکن
اسے تو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ ان سفید ڈاڑھیوں والے بزرگوں پر جن کی
جوانیاں مدت سے راکھ ہو چکی تھیں اور جو اب دوسروں کی جوانیاں راکھ کرنے پر
تلے ہوئے تھے۔ جنہوں نے اپنی اپنی جنسی آلودگیوں پر شرافت کا پردہ ڈال لیا
تھا۔ اور اب اس جھوٹی شرافت کے بل بوتے پر اپنے جوان لڑکوں اور پوتوں

سے کھوئے ہوئے لمحوں کا انتقام لے رہے تھے۔ پرکاش نے سوچا کیسی بے انصافی ہے۔ ہم لوگ بچپن ہی میں بوڑھے کر دیئے جاتے ہیں۔ ساری زندگی روتے گذرتی ہے اور پھر وہی بسورتے ہوئے چہرے لیکر مرگھٹ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس آنگن میں تو لڑکیاں خوب زور زور سے گا رہی تھیں اور قہقہے لگا رہی تھیں۔ پرکاش کو یہ ڈر تھا کہ ابھی کوئی بزرگ صورت آدمی کھڑکی میں سے جھانک کر کہہ دیگا۔

"لڑکیو۔! اتنا غل کیوں مچا رکھا ہے۔" اور رُت جگے کی سب رونق ماند پڑ جائے گی۔ اور چاتے ہوئے گلے۔ اس طرح خاموش ہو کر رہ جائیں گے۔ جیسے موت کے سرد اور برفیلے ہاتھ نے انہیں زور سے گھونٹ دیا ہو۔ بے چاری عورتوں کو تو آج ہی مدت کے بعد اپنے دبے ہوئے ارمانوں کو ذرا ڈھیل دینے کا موقع ملا تھا۔ وہ اس وقت فحش لچر اور بازاری گیت گا کر بہت مسرور ہو رہی تھیں۔ گیت کیا تھے سیدھی سادی جنسی گالیاں تھیں۔ جن میں ماں باپ، بہنوں، بھائیوں بہوؤں اور آشناؤں کے جائز اور ناجائز تعلقات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ وہ عورتیں جنہیں پرکاش شرم و حیا کی پتلیاں سمجھتا تھا۔ اب سب سے اونچی آواز میں سب سے گندے گیت گا رہی تھیں اور ان کے ننگے سر اور لہراتی ہوئی چوٹیاں دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ لیکن ایسے موقعے تو بہت کم آتے ہیں۔ کبھی کبھی ہی تو کوئی شادی ہوتی ہے۔ ورنہ کئی سال گذر جاتے ہیں اور ان عورتوں پر شرم و حیا کا جھوٹا ملمع چڑھا رہتا ہے اور پھر جب وہ بوڑھی مائیں اور ساسیں بن

جاتی ہیں تو اپنا سارا غصہ اپنی لڑکیوں اور بہوؤں پر اتارتی ہیں۔ یہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ اور اس طرح اندھے سماج کا چکر زندگی کی منزل پر سے گزر جاتا ہے۔ برجندر بڑے انہماک سے کھڑکی سے نیچے دیکھ رہا تھا کہ ایک شوخ لڑکی نے اس کی طرف دیکھ کر گایا۔

ہائے برجندر دے تیری ماسی۔
اونہوں لے گیا اک سنیاسی۔
ہائے دے اک سنیاسی
ہائے دے اک سنیاسی
دھب، دھب، دھب، دھب

اور بہت سی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر قہقہے لگانے لگیں اور برجندر شرما کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک بوڑھے بزرگ نے اسے ڈانٹ پلائی۔ تم کھڑکی میں کیوں کھڑے تھے۔ اگر گیت سننے کا ہی شوق ہے تو ادھر چارپائی پر بیٹھ کر آرام سے سنو۔ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے اور پرکاش نے سوچا کہ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے کہ برجندر کی ماسی کو لیجائے اک سنیاسی آخر ایک سنیاسی کیوں۔ ایک سنار یا چمار کیوں نہیں اور پھر اسے خیال آیا کہ ہندوستانی سماج میں سنیاسی اور فقیر لوگ بڑا عزت کے مالک ہیں۔ خدا کے یہ لاکھوں بندے کھاتے پیتے لوگوں سے بھیک مانگ کر ان کے ضمیر کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ عمل اور جدوجہد سے ان کے مستقبل کو روشن اور دلکش

بناتے ہیں۔ کایا کلپ کرتے ہیں۔ مکتی دلاتے ہیں۔ اور اولاد سے محروم بیویوں کو بچے عطا کرتے ہیں۔ مبارک ہیں ان کی زندگیاں، اور محبت سے لبریز ہیں ان کی روحیں اس لئے ماسی کا "سپاسی" کے ساتھ بھاگ جانا چنداں تعجب خیز نہ تھا۔ ان فحش گیتوں میں اور عورتوں کی مسرور نگاہوں میں پرکاش کو اپنے تمدن کی ننگی روح جھلکتی ہوئی نظر آئی۔ جس چیز کو ہر بڑے اور چھوٹے فرد نے گناہ کہہ کر دل کے نہاں خانے میں چھپا دیا تھا۔ آج وہی گناہ ابل کر گانے والیوں کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔ اور ڈھولک کی تال اور باریک آوازوں کی لرزتی ہوئی لے میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اور دوسری منزل پر یہ چیزیں ایسے ایسے بزرگ بھی سن رہے تھے، جن کی طویل زندگی کا شاہکار یہ تھا کہ انہوں نے عمر بھر اپنی بیوی اور ماں کے علاوہ اور کسی عورت سے ہنس کر بات بھی نہیں کی تھی۔ اسی لئے تو ایک معصوم شاعرہ ہلدی کی ایک گانٹھ کے عوض بیچ دی گئی تھی اور کھیتوں کی کھلی فضاؤں میں پلی ہوئی سندر لڑکیاں باسی کپڑوں اور مٹھائیوں کی دکان پر ایک سرسراتے ہوئے میلے پردے کے پیچھے قید کر دی گئی۔ غیر محدود تھی۔ عشق تازہ اور شباب زندہ تھا۔ لیکن تمدن بوڑھا اور عقل فرسودہ ہو چکی تھی۔ اور سماج کے نیلام گھر میں اب بھی عورتوں کو کھلے بندوں بیچا جاتا تھا۔ البتہ قانوناً غلامی ممنوع تھی۔ پرکاش نے دل میں کہا کہ وہ ایسی باتیں سوچتا سوچتا پاگل ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ سو جانے کی کوشش کرے، آنکھیں موند لے، اپنے ہونٹوں کو نیند سے بوجھل بنانے اور سرہانے پر سر ٹیک

ہر سو جائے اب گیت گائے جا رہے تھے ...... دولہا بھائی سہرا باندھے ہوئے تشریف لے آئے تھے ...... پرکاش وتی اور دولہا ہون کنڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پنڈت مقدس منتر پڑھ رہے تھے۔ شعلے گھی کا مزہ چکھ کر بلند ہوتے جاتے تھے ...... پنڈت زور زور سے منتر پڑھ رہا تھا...... پرکاش وتی اور دولہا خوشنما اور سبک بیدی کے اردگرد گھوم رہے تھے۔ ایک ...... دو ...... تین ...... چار ...... پانچ ...... چھ ...... سات ......

⁂

منزل

جب پرکاش چند نے آنکھ کھولی تو ابھی اندھیرا تھا۔ اگرچہ مشرقی افق پر روشنی کی ایک دھندلی سی لکیر آ گئی تھی لیکن آسمان پر ستارے ابھی تک بکھرے ہوئے تھے۔ نیچے آنگن کے فرش پر بیدی کے ارد گرد بہت سی عورتیں سوئی ہوئی تھیں۔ ہون کنڈ میں آگ بجھ گئی تھی اور بیدی پر لٹکے ہوئے کیلے کے پتے مرجھا گئے تھے۔ پرکاش نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے ارد گرد چارپائیوں پر گھر کے بہت سے لوگ سوئے ہوئے تھے۔ سوشیلا اور لیلا ڈھولک بجاتے بجاتے تھک کر چور ہو گئی تھیں۔ بیر کا چہرہ افسردہ تھا اور لب کھلے ہوئے اور اس سے پرے پرکاش وتی ایک بچرنگی ساڑھی پہنے سو رہی تھی۔ اس کا ایک بازو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا اور اسی بازو میں ہاتھی دانت کا سیندوری چوڑا چڑھا ہوا تھا۔ ماتھے پر سرخ بندی۔ اسے اس کے لب سکڑے ہوئے معلوم ہوئے ـــــ پرکاش نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ ہاں اب

تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ نئی سہاگن جو لکڑی کی بیدی پر اپنا کنوارپن لٹا چکی تھی۔ اب بھی خواب میں مسکرا رہی تھی۔ پرکاش اس مسکراہٹ کی طنز کی تاب نہ لا سکا۔

وہ آہستہ سے بستر پر سے اٹھ بیٹھا۔ وہ کسی کو جگانا نہ چاہتا تھا۔ وہ ہولے ہولے سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ آنگن کے فرش پر وہ نہایت احتیاط سے گزرا۔ اس کے چاروں طرف لڑکے، لڑکیوں اور عورتوں کے جسم پڑے تھے۔ کسی کے بازو ننگے کسی کی چھاتیاں کسی کے بالوں کی لٹیں کھلے ہونٹوں کے کناروں پر کسی کی آنکھیں نیم وا......

ان کے درمیان میں بیدی تھی۔ لیکن سہری ہار ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ کیلے کے پتے مرجھا گئے تھے۔ اور ہون کنڈ کی آگ بجھ گئی تھی۔ شعلوں نے قربانی لے لی تھی اور اب وہ خاموش تھے۔ زندہ انسان کھانے والوں نے ایک زندہ روح کو نگل لیا تھا۔ اور اب مدہوش تھے۔ پرکاش نے آہستہ سے دروازہ کے کواڑ کھولے اور باہر چلا گیا۔

وہ قصبے سے باہر کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ آسمان پر تارے بکھرے ہوئے تھے اور فرش زمین پر شبنم کے لاکھوں قطرے بیدار ہو رہے تھے۔ گم ہوتے ہوتے اندھیرے کی خنکی میں ایک عجیب سی تازگی تھی۔ اور جاگتی ہوئی سحر نے نور پہ ایک نیا حسن۔ کیکر اور شیشم کے تنوں پر نہ دکھائی دینے والے بیے ابھی تک بیں بیں کئے جاتے تھے اور کوئی نامعلوم پرندہ کو ہو، کو ہو رٹ رہا تھا۔ بیری کی جھاڑیوں پر گھاس کے تنکے ابھی تک سوئے پڑے تھے۔ اور پتوں کے درمیان گول گول بیروں سے شبنم کے موتی اس طرح لگے ہوئے تھے گویا مدورا کے مندر لٹکے ہوئے ہوں۔ زمین جیسے لمبے لمبے سانس لیکر بیدار

ہو رہی تھی۔ کھیتوں کے کناروں پر اُگی ہوئی گھاس میں ہزاروں نیلے نیلے پھول اپنی آنکھیں کھولنے لگے، پھر روشنی کی لکیر بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔

وہ کھیتوں میں دوڑتا ہوا چلا گیا۔ اس کے پائجامے کے پائنچے اور پاؤں میں پہنے ہوئے چپل شبنم میں دھوئے گئے۔ لیکن وہ دوڑتا ہی گیا۔ تاریکی کم ہوتی گئی۔ اور اس نے اپنے نتھنوں میں وہ عجیب سی خوشبو محسوس کی جس سے مشرق کی ہوا بوجھل تھی۔ آج اس نے پہلی مرتبہ صبح کو جاگتے دیکھا تھا۔ ورنہ شہر میں رہتے ہوئے تو اس کی آنکھ اس وقت کھلتی تھی، جب دھوپ کا پہلا پرتو کھڑکی کے شیشے سے نکل کر اس کے چہرے پر آجاتا تھا۔ لیکن آج وہ ایک غیر مرئی ہستی سے تعارف حاصل کر رہا تھا اور جب پورب کی ہوا اس کے چہرے کو چھو چھو کر گزرنے لگی۔ تو اس نے اپنی آنکھوں اور اپنے رخساروں پر صبح کی رانی کی نازک انگلیوں کے لمس کو محسوس کیا۔ اس کے عطر بیز بالوں کی خوشبو کو سونگھا اور اپنے ہونٹوں پر اس کے شبنمی لبوں کی حلاوت کا مزہ چکھا اور خوشی سے بھرپور دوڑتا چلا گیا۔

زمین اسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر مٹی کی سوندھی لطیف اور پاکیزہ خوشبو ایک ہلکے کہرے کی طرح چھائی تھی۔ آہستہ آہستہ درختوں کے تنوں پر سے اور گلہریوں کی دُمیں سرکنے لگیں اور کھیت کے کنارے ... کی اوٹ میں چھپتے ہوئے خرگوش بھاگنے لگے، دور ایک اونچی مینڈھ پر ایک مورنی کھڑی تھی اور مور اپنے دلکش پروں کے چھتر کو پھیلائے اس کے سامنے ناچ رہا تھا۔ ساری کائنات نغمہ ریز تھی۔

اور زمین محور پر گھومتی ہوئی ناچ رہی تھی۔ اس دلکش، دلفریب اور ابدی رقص کے سامنے
انسانی زندگیاں اس کی مسرتیں اور غم کس قدر ہیچ تھے۔ ان کا منبع نامعلوم اور ان کی منزل
ناپید....... مور کے چہرے پر مختلف رنگوں کی نازک جھلکیاں بدلتی جاتی تھیں۔ ارغوانی
.......آسمانی.......دھانی، خوشیاں......غم......زندگیاں.....
پرکاش نے سوچا یہ زمین ناچتی جائیگی، یہاں تک کہ انسانی زندگی۔ اس کی تہذیب، تمدن
اس کے دعاوی باطل راکھ کا ڈھیر ہو جائیں گے۔ زمین چاند کی طرح خاموش اور مغرور
ہو جائے گی۔ لیکن پھر بھی یہ زمین ناچتی جائے گی....... ہم کسقدر حقیر ہیں۔ پرکاش نے
سوچا۔ بیر کی پتیوں پر سوئے ہوئے ٹڈوں کی طرح....... یکایک کیکر کے ایک
درخت کی چوٹی پر بیٹھا ہوا کوا چیخ اٹھا اور ساری کائنات میں اجالا ہی اجالا ہو گیا۔ زمین
کا رقص رک گیا۔ پپیہے کی پیا پیا بند ہو گئی۔ مور اور مورنی مغرب میں آموں کے جھنڈ کی
طرف پرواز کر گئے اور پرکاش کھیتوں میں دوڑتا دوڑتا رک گیا اور ہنسنے لگا۔ ہائے وہ
صبح کی رانی کہاں گئی۔ !......... وہ رانی جو گم ہوتے ہوئے اندھیرے کے
نازک سایوں میں شبنم کے موتی چمکاتی ہوئی آئی تھی۔ اور بڑھتے ہوئے نور سے شرما کر پھر
اسی تاریکی میں گم ہو گئی....... ہائے وہ صبح کی رانی! وہ بہت دیر تک ایک رہٹ پہ
نہاتا رہا۔ اس کی روح ہلکی ہو گئی تھی۔ اور دل و دماغ ہر قسم کے خیالات سے گریزاں
آم کے درختوں پر چھوٹی چھوٹی سبز کیریاں لٹک رہی تھیں۔ اور ہرے بھرے طوطے
ٹیں ٹیں کر رہے تھے۔ بیلوں کے پیچھے بیٹھا ہوا کسان ایک کھلونا معلوم ہو رہا تھا۔ اور

بیل رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے...... ڈوں...... ڈوں...... ڈوں
ڈوں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کے ہر ذرے سے آواز نکل رہی ہے......

روں...... روں........ روں۔ اس بے مطلب اور بے معنی صدا میں اسے ایک نامعلوم
سی مسرت محسوس ہونے لگی اور وہ آنکھیں بند کر کے نہاتا گیا اور سنتا گیا........

روں...... روں بے مطلب، بے معنی۔ منبع نامعلوم۔ منزل ناپید...... اب وہ
آنکھیں بند کئے ہوئے بھی بیلوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے اس کسان کو دیکھ رہا تھا جو کولہو
کی طرح معدوم ہو رہا تھا اور بیل جو رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے......

روں...... روں...... روں......

٭

گرجن کی ایک شام

عشق اور ارضی کی بحث بہت پرانی ہے۔ وہ ادیب جو ہر وقت
آسمان پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کی خدمت میں حرف یہ کہنے کی جسارت
کرتا ہوں کہ ہماری زمین بھی ایک ستارہ ہے۔

(میکسم گورکی)

مدتوں سے تمہیں خط نہیں لکھ سکا۔ شاید اوشا کی فریب کاریوں کو بھولنے کی کوشش
کر رہا تھا یا پھر جگدیش کی دلدوز محبت کا آخری منظر دیکھنے میں مصروف تھا۔ کچھ ٹھیک
طرح سے تمہیں نہیں بتا سکتا۔ ممکن ہے کہ تم پوچھو۔ کیا جگدیش بھی محبت کر سکتا ہے۔ موٹا
سا آدمی۔ گو کچھ اتنا موٹا بھی نہیں۔ لبوں پر ہر وقت مسکراہٹ شکار کا شوقین۔ برج اور
بیر کا پجاری۔ کیا ایسا شخص بھی الفت کی ستمگاریوں کی تاب لا سکتا ہے۔ تو میری جان میرے
پاس اس کا جواب یہ ہے کہ۔۔۔ مگر نہیں یہ بہتر ہوگا کہ پہلے میں تمہیں اس جگہ کے
متعلق بتاؤں جہاں ہم گذشتہ ڈیڑھ ماہ سے پڑے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ماحول نہ صرف
حیات معاشقہ کا بلکہ ہماری تمام زندگی کا جزو اعظم ہے اور خاص کر محبت اور ماحول

میں جو گہرا تعلق ہے۔ وہ مجنوں کی بادیہ پیمائی اور فرہاد کی کوہکنی سے عیاں نہیں ہے۔ دور کیوں جاؤ۔ تمہارے وطن پنجاب ہی میں سوہنی مہینوال کا افسانہ محبت دریائے چناب کی پرشور روانیوں کا رہین منت ہے اور ہیر رانجھے کا دلفریب قصہ الفت ذات پات اور قبائلی رکاوٹوں کی دیوار پر خشتِ بیجان کی طرح آویزاں نظر آتا ہے۔ اور سچ پوچھو تو غالباً ہم کبھی فردِ واحد سے محبت نہیں کرتے بلکہ اگر محبت کرتے ہیں تو صرف اپنے آپ سے۔ دراصل انسانی محبت بذاتِ خود ایک حقیر سی شے ہے، محبت ہے کیا۔ دو دھڑکتے ہوئے دلوں کا سنگم، لیکن جو چیز اسے عرفانی بلندیوں پر لے جاتی ہے یا پستیوں میں گرا دیتی ہے وہ اس کا ماحول ہی ہے۔ ماحول کی اہمیت سے انکار زندگی کی عظمت سے انکار ہے۔ بچارا جگدلش بھی ایسا ہی کہا کرتا تھا۔ لیکن آج اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے پوچھو جن کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں اور جنگی گہرائیوں کا الم کسی بے کس زخمی، سسکتے ہوئے آہو کے درد کا آئینہ دار ہے۔

سب سے پہلی بات جو میں تمہیں اس جگہ کی بابت بتانا چاہتا ہوں وہ اس کی بلندی ہے۔ یہ جگہ سطح سمندر سے ستر ہزار فٹ بلند ہے۔ اس رفعت پر پہنچ کر انسانی محبت بھی بلند ہو جاتی ہے۔ خیالات و تاثرات میں غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ دماغ پر ایک عجیب سا وجد طاری ہو جاتا ہے۔ تنفس کا دورہ تیز ہو جاتا ہے اور اب معلوم ہوتا ہے کہ کاندھوں پر سے منوں بوجھ تھا۔ جو اٹھ گیا۔ اوپر دیکھو تو اڑنے کو جی چاہتا ہے اور نیچے دیکھو تو دور میلوں تک سلسلہ ہائے کوہ گرتے

ابھرتے اور پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چشم زدن میں نظراں پہاڑوں اور وادیوں سے پھسلتی ہوئی نچلے میدانوں پہ پڑتی ہے۔ اور نظر کا آخری نقطہ وہ ہے جہاں دریائے جہلم کا پانی چاندی کے پتلے تار کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس بلندی پہ پہنچکر آدمی سب پستیوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا ہی پاک دھلا ہوا سمجھتا ہے جتنی کہ یہ سپید برف جس کی آب و تاب میں موت کی خاموشی اور قدرت کی پاکیزگی پنہاں ہے۔

یہاں آکر مجھے احساس ہوا کہ اوشا کی محبت کتنی حقیر تھی اور اس کا دائرہ کتنا محدود، یہ وہ محبت تھی جو صرف ڈرائینگ روم ہی میں کی جاسکتی ہے۔ اس استوائی پھول کی طرح جو شیشے کی دیواروں کے اندر ایک محبوس باغیچے ہی میں کھل سکتا ہے اور مصنوعی روشنی، مصنوعی حرارت اور مصنوعی غذائیت کا محتاج ہے، ڈرائینگ روم۔ ریشمی ساریاں۔ برقی قمقمے۔ مصنوعی چلتے ہوئے فقرے۔ میں حیران ہوں کیا واقعی مجھے اوشا سے محبت تھی یا شاید یہ اس غیر فطری ماحول کا اثر تھا، جو باہر کی کھلی اور خوشگوار فضا میں پہنچ کر مٹ گیا۔

یہاں بجلیاں کوندتی ہیں، بادل گرجتے ہیں، رم جھم، رم جھم بارش ہوتی ہے اولے پڑتے ہیں۔ برف گرتی ہے۔ پھر ہوا کے چند تیز و تند جھونکے آتے ہیں۔ اور مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ آسمان خوشنما، نیلگوں، آفتاب سونے کے تھال کی طرح درخشاں اور پر پھیلائے ہوئے۔ ہوا میں تیرتی ہوئی چیل کسی پری کی طرح حسین نظر آتی ہے۔ ہم اپنے خیمے کا جالی دار پردہ کھولتے ہیں۔ گرم کافی کی پیالی ہاتھ میں بندوق کاندھے پر لٹکائے

باہر نظر دوڑاتے ہیں۔ چاروں طرف برف ہے۔ ہوا خاموش ہے۔ آسمان صاف ہے۔ آہستہ آہستہ کافی پیتے اور چمڑے کے جوتوں کے اوپر دھان کے خوشوں سے بنے ہوئے جوتے پہن لیتے ہیں اور شکار کی تلاش میں چل پڑتے ہیں۔ یہاں شکار بہت ملتا ہے۔ جنگلی بکریاں، رونسے، ریچھ اور بھیڑیے۔ موخرالذکر ہو سے بھٹکے شکاریوں کو ہی شکار کر لیتے ہیں۔ پھر رات کے وقت الاؤ کے قریب خیمہ میں بچارا چوکیدار اور اس کا جانباز کتا آگے تاپتے ہوئے مایوسانہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ کالی رات میں ہوا سیٹیاں بجاتی ہے۔ بھیڑیے چلاتے ہیں۔ پھر برف کے تودوں کے گرنے سے ایک مہیب اور خوفناک آواز پیدا ہوتی ہے جو دور دور تک پھیلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بعد خاموشی، مکمل خاموشی، موت اور سکون۔ شکاری نہیں آیا۔ شکاری اب کبھی نہیں آئے گا۔ شکار کرتے کرتے وہ خود شکار ہو گیا۔ اس کی ہڈیاں برف کے تودوں کے نیچے ہیں۔ اور ان پر بھیڑیے ناچ رہے ہیں۔

لیکن گھبراؤ نہیں دوست۔ ہم ابھی تک زندہ ہیں۔ صحیح وسلامت اور اب تک ایک درجن کے قریب ریچھوں، رونسوں، اور بھیڑیوں کو گولی کا نشانہ بنا چکے ہیں۔

جس جگہ ہمارا کیمپ ہے، اس سے کوئی ڈیڑھ پونے دو میل نیچے مغرب کی طرف گُریز کا دلکش مقام ہے۔ اس سے زیادہ دلکش جگہ میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ یہاں سے پورے دو میل بھی نہ ہوگا۔ لیکن اف! کتنا دشوار گذار راستہ ہے اور پھر کئی جگہ اسقدر

پھسلن ہے کہ اگر ذرا پاؤں اِدھر اُدھر ہونے سے توازن برقرار نہ رہا تو چلنے والا چشم زدن میں سیکڑوں فٹ نیچے برف سے اٹی ہوئی کسی کھڈ میں جا گرتا ہے۔ اب تو ہم اس راستے سے کسی قدر واقف ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی متواتر برف و باراں سے ہر روز نیا راستہ تراشنا پڑتا ہے۔ اور پھر بھی دلجمعی سے چلتے چلتے دائیں یا بائیں نیچے نظر پڑ جائے تو ان بے پناہ گہرائیوں کو دیکھ کر سارے جسم میں بے اختیار جھرجھری سی آجاتی ہے۔

گرجن کا مقام گرمیوں میں رہنے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ وہ ہزاروں سیاح جو ہر سال گلمرگ جاتے ہیں، انہیں یہ معلوم نہیں کہ گرجن گلمرگ سے کسقدر نزدیک ہے۔ گرجن میں کہیں کہیں برف کے ٹیلے ہیں تو کہیں ایسے ہموار قطعے جن پر گرمیوں میں ریشم کی طرح نرم اور ملائم گھاس اگتی ہے۔ کہیں کہیں پہاڑ کی شکنوں میں تنگ کے تناور درخت کھڑے ہیں جو برف و باراں میں محفوظ خیموں کا کام دیتے ہیں۔ یہاں پانچ جھیلیں ہیں چھوٹی چھوٹی اور خوشنما سب سے بڑی جھیل کو نندن سر کہتے ہیں۔ یہ کوئی ڈھائی تین میل لمبی چوڑی ہوگی۔ سال میں دس مہینے یخ بستہ رہتی ہے۔ لیکن جب ہم نے اسے دیکھا تو گہرے نیلے رنگ کا ایک تختۂ آب بن رہی تھی، اور چاروں طرف پیلے پیلے جنگلی پھولوں سے مرصع تھی۔ یہ جھیلیں غالباً دنیا کی سب سے اونچی جھیلوں میں سے ہوں گی اور اس زمانے کی یاد دلاتی ہیں جب تمام دنیا زیرِ سطح آب تھی۔ پھر جب آہستہ آہستہ ہمالیہ کے پہاڑ نمودار ہوئے تو یہ جھیلیں وہیں پانی کے گڑھوں کے مانند رہ گئیں۔

نندن سر پر غروبِ آفتاب کا جو نظارہ ہوتا ہے۔ وہ نہ جھیل ڈل پر میسر ہے۔

نہ ولر پر، یہاں نہ ہوٹل ہیں نہ شکارے۔ نہ سیاح۔ نہ موٹریں، نہایت دشوار گذار راستے ہیں جو سال میں صرف تین چار ماہ کھلے رہتے ہیں۔ اور گرجن پر جفاکش اور خانہ بدوش گڈریے اپنے ریوڑوں کو گرجن کے مرغزاروں میں چرانے کے لئے لاتے ہیں۔ اور اگست کے پہلے ہفتے ہی میں پھر نیچے کی آبادیوں میں چلے جاتے ہیں۔ شاذ ہی کوئی سیاح یہاں آنکلتا ہے شکار کا شوقین یا تنہائی کا دلدادہ، اور پھر اسے شاذ ہی واپس جانا نصیب ہوتا ہے پھر یہیں کہیں برف کے تودوں میں یا بھیڑیوں کے پیٹ میں، یا ان نشادر شگوں کے قریب اس کی قبر بنتی ہے۔ اس لحاظ سے گرجن کے دیوتا کو پردیسیوں، مسافروں اور سیاحوں سے بہت نفرت ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ماسوائے، ان پہاڑی گڈریوں کے جو اسے پوجتے ہیں، اور کسی کا بھی اس کے علاقے میں گزر ہو۔ گڈریئے جانتے ہیں کہ گرجن دیوتا جس پر ناراض ہوتا ہے اسے موت کی سزا دیتا ہے، اور جس پر خوش ہوتا ہے اس کی بکریوں میں دودھ زیادہ کر دیتا ہے، اس کی بھیڑوں کو نہایت خوبصورت ملائم ریشم سے ڈھک دیتا ہے۔ برف میں، جھکڑ میں، طوفان میں، ہر حالت میں اس کے ریوڑ کی حفاظت کرتا ہے۔

گرجن کی ایک دلفریب شام کا ذکر ہے، میں جگدیش اور ولیا ایک پہاڑی شکاری جسے ہم نرائی کے علاقے سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ شکار کھیل کر واپس کیمپ کی طرف جا رہے تھے۔ اور راستے میں نندن سر کے مقام پر بیٹھ کر سستانے لگے تھے۔ اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا، ہوا میں ایسی خنکی تھی کہ ہر سانس میں برف

کے لطیف گالے منہ کے اندر جاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ گرجن کی چوٹی پر اجلے اجلے
بادل منڈلا رہے تھے۔ بادلوں اور ڈوبتے ہوئے سورج کے عکس سے ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ کسی عالیشان محل کے نیلگوں فرش پر ایک طلائی ستون کھڑا ہے اور ایک مرمریں
محراب کو سہارا دے رہا ہے۔ معاً جگدیش نے پانی کی سطح پر ایک سنگریزہ پھینکا۔
ارتعاش پیدا ہوا۔ اور دوسرے لمحہ میں وہ خوبصورت محل اور طلائی ستون تھر
تھرا کر لاکھوں جواہر ریزوں کی صورت میں بکھر گیا۔ اب پانی کی سطح پر لاکھوں
سورج متلاطم تھے۔ جگدیش نے ہاتھ بڑھا کر اپنے قریب کے پیلے پیلے پھولوں
کو توڑ کر ایک گچھا بنایا اور انہیں اپنے کوٹ پر ٹانکتے ہوئے بولا۔ "کتنے خوبصورت
پھول ہیں۔ ان کی مہک، ان کا رنگ، یہ مست کر دینے والا کیف آور تعطر۔ ریوا
ان خوبصورت پھولوں کا کیا نام ہے۔؟"

ریوا کسمسایا، وہ روشنوں کی قسمیں پہچانتا تھا۔ ریچھوں کو دو میل کی دوری
سے سونگھ لیتا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں عقاب کی سی تیزی تھی۔ جوسن کی طرح سامنے
سے اڑنے والے بھنورے پر نشانہ لگاتے میں بھی کبھی غلطی نہ کرتی تھی۔ لیکن وہ ان پھولوں
کا نام نہ جانتا تھا۔ اچھا شکاری کبھی اچھا شاعر نہیں ہوتا۔ اس کے بھورے رخسار
اور بھی بھورے ہو گئے۔ اور وہ رک رک کر بولا۔ "مجھے — پتہ — نہیں۔"

جگدیش کو ریوا کی بے چینی میں بہت لطف آیا۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔
"ٹھیک ہے ان پھولوں کے نام سے کسی کو آگاہ نہ ہونا چاہیے۔ شاید ان

پھولوں کا کوئی نام ہی نہیں۔ اور یوں بھی خوبصورتی کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ حسن کی کوئی ذات نہیں۔"

میں نے مسکرا کر احتجاجاً کہا۔ "جملہ حقوق محفوظ، تم میری باتیں دہرا رہے ہو۔"

ریوا بے چینی سے اپنی جگہ پر ہلا۔

جگدیش نے مزاحاً کہا۔ "ہونہہ۔ جملہ حقوق محفوظ! شاید تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم اوشا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہو۔ ارے بھلے مانس، یہ گرجن ہے گرجن۔"

جگدیش نے بمشکل یہ فقرہ زبان سے ادا کیا ہوگا کہ بادل زور سے گرجا۔ یہاں موسم کتنا غیر معین ہے۔ پل میں دھوپ، پل میں برف و باراں، ریوا نے ایک نظر بھر کر ان بادلوں کی طرف دیکھا جو اب گرجن کی چوٹی کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔ اس نے نتھنے پھیلا کر شمالی ہوا کو سونگھا۔ اور پھر اپنے فرغل کے بٹن بند کرتے ہوئے بولا۔ "جلدی چلو۔ طوفان آرہا ہے۔"

ہم نے اپنی سمور کی ٹوپیاں پھولوں کے تختوں سے ڈھونڈ نکالیں اور انہیں پہن کر چل کھڑے ہوئے۔ اگرچہ ابھی دھوپ چمک رہی تھی۔ لیکن کئی جگہوں پر پہاڑوں اور گھاٹیوں کے مختلف حصوں پر سفید بادل اپنا سایہ ڈال رہے تھے۔ ہوا کی خنکی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ہمیں تو ابھی بہت اوپر اپنے کیمپ تک پہنچنا تھا۔ ہم جلد جلد لیکن نہایت خاموشی سے راستے پر چڑھتے جاتے تھے۔ گرجن کی چوٹی پر سے

بادل نیچے کی طرف پھسل رہے تھے۔ ایک ہلکا سا جھکڑ چلنے لگا تھا۔ اور کہیں کہیں روئی جیسی پتلی اور ہلکی دھند ہمارے راستہ میں آجاتی تھی۔ ہم نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی، لیکن کوئی پون گھنٹہ کے سفر کے بعد طوفان نے ہمیں آہی لیا۔ ہلکی ہلکی بارش، اور پھر کڑی اور اس کے ساتھ فوراً ہی برف گرنی شروع ہوئی۔ ریوا سب سے آگے تھا، درمیان میں جگدیش، اور آخر میں میں، ہم تینوں کی کمر میں ایک ہی رسی بندھی ہوئی تھی۔ ریوا کا اندازہ تھا کہ پندرہ بیس منٹ اور چلے۔ یکا یک میری کمر کو ایک سخت جھٹکا لگا۔ بہت سخت، اتنا کہ اگر میرے حواس بجا نہ ہوتے اور برچھا میرے پاس نہ ہوتا تو میں یقیناً اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکتا۔ اب میں برچھے کے سہارے کھڑا زور لگا رہا تھا کیونکہ رستا بائیں طرف جھکا ہوا تھا۔ چاروں طرف دھند چھا گئی تھی۔

اوپر سے ریوا کی آواز آئی۔ "سنبھل جاؤ۔ سنبھل جاؤ۔"

"کیا ہوا۔ ؟" میں نے چلا کر کہا۔

جگدیش کی آواز آئی۔ "میں برف پر گر گیا ہوں۔ اُف کتنا درد ہے اٹھا نہیں جاتا۔ پاؤں میں ضرب آگئی ہے۔"

"اٹھو، اٹھو، کوشش کرو۔" میں نے رسی پر زور لگاتے ہوئے کہا۔

طوفان نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ دھند سفید تھی۔ لیکن تاریکی سے بھی بدتر، میرے اور ریوا کے درمیان جگدیش کہیں بیچ میں برف پر گرا ہوا تھا اور ہم اسے اٹھا نہ سکتے تھے۔

ریوا کی آواز آئی۔ "توازن ٹھیک رکھو۔ رسی کو دائیں طرف جھٹکا دو، ایک

"........ دُو .... تین۔"

بڑا زور لگایا۔ لیکن جگدیش اٹھ نہ سکا۔

آخر رسی کو بل دیتے ہوئے اور پیچھے سے کچھ گرہیں باندھتے ہوئے میں، ریوا اور جگدیش تینوں ایک مقام پر جمع ہو گئے۔ میں نیچے سے چل کر اوپر جگدیش گھٹنوں کے بل پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔

"کیا ہوا جگدیش۔" میں نے جھک کر جگدیش کو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

جگدیش سہارا لیکر اٹھ کھڑا ہوا، مگر پھر فوراً برف پر بیٹھ گیا۔ "مجھ سے تو اب چلا بھی نہ جائیگا۔ پاؤں میں ضرب آئی ہے۔"

چاروں طرف سفید دھند چھا گئی تھی۔ ہوا میں ایک وحشیانہ تیزی تھی۔ برف خاموشی سے گر رہی تھی۔

"ہُو .... ہُوآ .... آآآ ہُو .... ہُوا .... آآآ ..

ہُو" ریوا نے دوبارہ سیٹی بجائی۔ سیٹی کی تیز آواز کسی نوکدار خنجر کی دھار کی طرح تیرتی ہوئی، طوفان کو چیرتی ہوئی گذر گئی۔ اور پھر چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

ہُو آ .... آ .... آ ہُو، ہُو ک .... آ .... آ .... آ .... ہُو"

ریوا نے چند لمحوں کے بعد پھر سیٹی بجائی۔ کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔

ریوا نے ایک متعین وقفے کے بعد پھر سیٹی بجائی۔ اور ہم تینوں دھڑکتے ہوئے دلوں سے اس کے جواب کے منتظر رہے۔ لیکن کانوں میں صرف بڑھتے ہوئے طوفان کے

وحشیانہ قہقہے تھے برودی دم بدم بڑھ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں سن ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں نیند آرہی تھی۔

"مت سوؤ۔ جگدلیش مت سوؤ۔" ریوانے سیٹیوں کے درمیان کے وقفے میں کہا۔

میری آنکھوں میں ایک عجیب سا خمار چھا رہا تھا۔ پپوٹے بند ہوئے جاتے تھے۔ جانتا تھا کہ مجھے سونا چاہیئے۔ جانتا تھا کہ یہ خمار موت کا خمار ہے یہ نیند اجل کی نیند ہے۔ آخری اور کبھی نہ ختم ہونے والی نیند۔ پھر بھی آنکھیں جھپک جھپک جاتی تھیں اور جگدلیش بچارا تو بالکل اونگھ رہا تھا۔

ریوانے ہم دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میری بات سنو، میری بات سنو، دیکھو دیکھو۔ میری طرف دیکھو، اپنی مٹھیوں پر برف بھینچ لو۔ زور سے زور لگاؤ۔ اور زور لگاؤ اور......"

"ہوآآآ...... ہو...... ہوآآآ...... ہو۔" دور نیچے سے کسی مدھم سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ریوانے جواب میں سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز۔ ایسا معلوم ہوا کہ دور دور پھیلتی جا رہی ہے۔ اور خطرے کا سگنل دے رہی ہے۔ امداد کے لئے پکار رہی ہے۔ اس سیٹی میں کتنا خوف تھا۔ کتنی التجا۔ کتنا درد، کتنی امید، ہمارے کان اس کے جواب کی طرف لگ گئے۔ کیا سچ مچ سیٹی کا جواب آیا تھا۔ کیا یہ محض ایک واہمہ تھا۔ مگر نہیں دور نیچے کہیں سے پھر سیٹی کی آواز سنائی دی۔ مدھم، میٹھی۔ امید بھری

اس برفانی طوفان میں وہ سیٹی روشنی کے مینار کی طرح چمک اٹھی۔

تھوڑے توقف کے بعد ریلا نے پھر سیٹی بجائی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا جواب آیا۔ ایک سیٹی کہہ رہی تھی۔ "ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ طوفان میں گھرے ہوئے ہیں۔" دوسری کہہ رہی تھی۔ "گھبراؤ نہیں۔ ہم آرہے ہیں۔" دوسری سیٹی نزدیک آتے آتے پھر دور ہو جاتی۔ شاید راستے سے پرے ہٹنا پڑا ہوگا۔ اس طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔ آدھ گھنٹہ اور۔ اب آنے والا ہمارے نزدیک ہی کہیں تھا۔ چند منٹ اور اضطراب میں گزرے۔ اب ہمارے سامنے ایک جفاکش ادھیڑ کا پہاڑی کھڑا تھا۔ اس کی چھاتی پر ایک لالٹین بندھی تھی۔ جس کی مدھم روشنی اس تاریک دھند کو چیرتی ہوئی بمشکل ایک دو گز دور جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھریرے بدن کا جوان کھڑا تھا۔ لیکن دھند میں ان کی صورتیں اچھی طرح پہچانی نہ جاتی تھیں بس سائے سے معلوم ہوتے تھے۔

جفاکش پہاڑی نے پوچھا۔ "کیا بات ہے، طوفان میں کیسے گھر گئے؟"

ریلا نے جواب دیا۔ "ہمارے ساتھی کو چوٹ آگئی اور ــــ" اس نے فقرہ ناتمام رہنے دیا۔

جفاکش پہاڑی چند منٹ تک چپ رہا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

چند منٹ آرام کے بعد پہاڑی نے چھریرے بدن کے جوان کو جگدیش کی طرف

اشارہ کرکے کہا۔ "اسے اٹھالو۔ میں بمشکل راستے کی رہنمائی کرسکوں گا۔"

چھریرے سائے نے چند لمحوں کے لئے توقف کیا۔ پھر وہ جھکا اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے جگدیش کو اٹھاکر اپنی پشت پر گردن کے قریب رکھ لیا۔ دوسرے پہاڑی نے ایک رسی سے جگدیش کی ٹانگیں اس کی کر سے باندھ دیں پھر ایک رسا اپنی کمر سے باندھ کر اس جوان کی کمر کے گرد لپیٹا۔ پھر وہ رسا مجھ تک پہنچا، میں نے اسے کمر میں باندھ کر دیوا کے حوالے کیا۔ آخر میں ریوا نے اسے مضبوطی سے اپنی کمر میں باندھ لیا۔

"تیار ہو۔" پہاڑی نے ہمیں چوکنا کرتے ہوئے کہا۔ "برچھے مضبوطی سے تھامو۔ ایک......دو......تین۔" اور اس طرح رات کی تاریکی میں، برف کے خطرناک سمندر میں یہ کارواں از سرِ نو گرجن کو چلا۔

پہاڑی کا گھر ایک ننگ کے نیچے تھا، وہاں پہنچکر اس نے جلدی سے دو تین کھالیں نکالیں اور زمین پر بچھائیں اور دوسرے پہاڑی نے جگدیش کو وہاں لٹا دیا۔ جگدیش بیہوش تھا۔ یا شاید برف کی نیند سو رہا تھا۔ ادھیڑ عمر کا پہاڑی تنے کی کوکھ کے اندر گیا۔ اور وہاں سے اپنی مٹھی میں ایک گول مڑی ہوئی چمڑے کی تھیلی سی باہر لایا۔ الاؤ کی سرخ روشنی میں میں نے دیکھا۔ یہ ایک نافہ تھا۔

"ذی شی لالٹین بجھا دو۔" پہاڑی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ جو اب ایک طرف اندھیرے میں بیٹھا ہوا سستا رہا تھا۔ اندھیرے میں ایک لمبے سانس کی آواز سنائی دی اور پہاڑی کا ساتھی الاؤ کی طرف بڑھا۔ اسے تاریکی سے روشنی میں آتے ہوئے

میں نے دیکھا کہ وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ اب اس نے اپنی سمور کی ٹوپی اتار پھینکی تھی جس نے اس کے لمبے بالوں کو چھپا رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں تکان سے نم زدہ تھیں اور جبیں پسینے سے تر تھی۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس نے پہاڑی کی گرم لالٹین کو کھولا۔ اور ایک پھونک مار کر اسے بجھا دیا۔ پھر لالٹین ہاتھ میں لیکر سر کو ایک طرف جھکائے ہوئے واپس اندھیرے میں چلی گئی۔

پہاڑی گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اور جگدیش کے تنفس پر غور کرنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے لکڑی کے بڑے چمچے میں تھوڑا سا گرم دودھ اور نافہ ڈال کر ہلایا اور اسے جگدیش کے منہ میں انڈیل دیا۔ ایک اور چمچے میں اس نے کوئی اور چیز گرم کی جو غالباً کسی جانور کی چربی معلوم ہوتی تھی۔ اور بہت بدبودار تھی۔ جب وہ چربی بھی گرم ہو کر سیال بن گئی تو اس میں بھی اس نے تھوڑا سا نافہ ڈال دیا۔ اور اسے انگلی سے ہلاتے ہوئے ذی شی کو پکارا۔

"کیوں۔ کیا بات ہے۔ با" ذی شی نے وہیں اندھیرے میں بیٹھے ہوئے جواب دیا۔ اس کی آواز سست اور مضمحل تھی۔

"ادھر آنا بیٹیا۔ ذرا اس کی کنپٹیوں کو آہستہ آہستہ سہلاؤ۔ یہ لو روغن۔"

ذی شی نے جگدیش کا کنٹوپ اتار لیا۔ اور اس کا سر اپنی گود میں لیکر اس کی کنپٹیوں کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔ پہاڑی تنے کا سہارا لیکر بیٹھ گیا۔ الاؤ کے سرخ ہالے میں پہاڑی کا شکن آلود چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی کسی قدر مضبوط تھی۔

اور گردن کی رگیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ جگدیش کا سانس کبھی دھیما ہو جاتا کبھی تیز چلنے لگتا۔ کبھی اس میں گرڑ گرڑ کی سی آواز پیدا ہوتی جیسے کسی گھڑی کو چابی دیتے وقت سنائی دیتی ہے........ لڑکی دھیرے دھیرے کنپٹیاں سہلا رہی تھی۔ اس کے سہلانے سے چُر چُر چُرڑ کی ایک عجیب خواب آور سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ میں ادھ مندی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ جگدیش پر اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اس کا آدھا چہرہ اندھیرے میں تھا اور آدھا الاؤ کے ہالے میں، میں اس کا چہرہ صاف دیکھ سکتا تھا۔ پر آریں اور منگول خطوط کا ایک حسین مرقع تھا۔ زعفران اور گلاب کے رنگوں کا ایک دلربا امتزاج۔ اس کے غلافی پپوٹے اس طرح جھکے ہوئے تھے کہ آنکھیں بالکل بند معلوم ہوتی تھیں۔ ذی شعور........ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں یہ ایک خواب ہے یہ جوان لڑکی، یہ پہاڑی لونا، یہ تنگ کا تنا۔ یہ سرخ الاؤ۔ یہ سب کچھ ایک طویل خواب ہے شاید میں اوشا کے بیٹھنے کے کمرے میں صوفے پر لیٹا ہوا اس سپنے کو دیکھ رہا ہوں۔ اور وہ ابھی ابھی ایک نیلی ساڑھی پہن کر اندر آئے گی اور مجھے سوتا دیکھ کر اپنی تحقیر آمیز ہنسی سے مجھے جگا دے گی۔ اٹھو بے نکر الو۔ ساڑھے پانچ بج گئے۔ لیڈی کنسر ڈ کا حکم........ میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ قدرے توقف کے بعد میں نے پھر آنکھیں کھولیں تو وہی منظر تھا۔ وہی پہاڑی لونا درخت سے پیٹھ لگائے بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ لڑکی جگدیش کا سر سہلا رہی تھی۔ جگدیش کا تنفس اب صاف چل رہا تھا۔ الاؤ دہک کر تنگ ہو گیا تھا۔ اونگھنے جا گئے، پلکیں جھپک جھپک، جھپکتے اس

اس خوبصورت کو دیکھتے دیکھتے آہستہ آہستہ یہ سارا منظر ایک سکون ریز دھند کے میں غائب ہوگیا۔

جب دوسرے دن آنکھ کھلی، تو نہ جگدیش تھا۔ نہ وہ جوان لڑکی۔ پہاڑی بونا بھی غائب تھا۔ میں اکیلا تنگ کے وسیع سائے میں لیٹا ہوا تھا کچھ دیر دل میں یہ خیال جاگزیں رہا۔ کہ کل جو کچھ دیکھا تھا محض ایک افسانہ تھا، آنکھیں ملتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پہلے تنے کی کوکھ نظر آئی، پھر دُور پرے دھوپ میں ایک ریوڑ چرتا ہوا نظر آیا۔ ڈھارس سا بندھی، زور سے آواز دی۔

"جگدیش ــــ او جگدیش۔"

ریوڑ میں سے دو ایک بکریوں نے منہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"جگدیش۔" میں زور سے چلایا۔ "او جگدیش۔ نامعقول جگدیش۔"

یکایک تنے کی کوکھ سے پہاڑی مسکراتا ہوا نکلا۔ "گرجن دیوتا کی مہربانی سے کل آپ کی جان بچ گئی۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا، اور پہاڑی کی طرف تکتے ہوئے کہنے لگا۔ "شکریہ تمہارا اور تمہاری بہادر لڑکی کا ہزار بار شکریہ۔"

"کیا نام ہے اس کا۔؟ ذی شو۔؟"

"ہاں، ذی شی، اس کا نام ہے۔ میری ننھی ذی شی بہت اچھی لڑکی ہے۔ گرجن دیوتا اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ سب برفیلے راستوں سے واقف ہے اسے

گرجن دیوتا کبھی کوئی گزند نہیں پہنچنے دیتے۔ چھوٹی عمر ہی میں اس کی ماں مرگئی تھی گرجن دیوتا ہی نے پالا ہے۔ گرجن دیوتا ذی شی سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

ایک گرجن دیوتا پر ہی کیا موقوف ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ اس سے تو ہر کسی کا دل محبت کرنے کو چاہتا ہے۔ میں نے پہاڑی بونے سے پوچھا۔ "جگدیش کہاں ہے؟"

پہاڑی نے جواب دیا صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو پاؤں کی موچ بالکل نکل چکی تھی۔ اب ذرا نندن سرنک سیر کرنے کو گئے ہیں۔ ذی شی کو میں نے ان کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ وہ دونوں اب واپس آتے ہی ہوں گے۔ آپ تو خوب سوئے۔"

ہاں میں تو خوب سویا۔ میں نے دل میں سوچا۔ کیونکہ رات بھر کسی کا نے میری کنپٹیوں پر مالش نہیں کی۔ وہ دونوں۔ یہ لفظ سن کر میرے دل میں ایک نامعلوم سی خلش پیدا ہوتی۔ ایک خفیف سا انتشار، کمبخت جگدیش ہر بار بازی لے جاتا ہے۔ میں نے پہاڑی سے آہستہ سے پوچھا۔ "نندن سر یہاں سے کتنی دور ہے۔؟"

"یہی کوئی کوس بھر۔ سیدھے اس طرف وہ۔!"

"اچھا میں بھی نہا دھو آؤں۔" بوڑھے یہ کہہ کر میں چلتا بنا۔

میں چل رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ جگدیش نہ تو لارڈ بائرن کی طرح لنگڑا ہے۔ اور نہ ڈان جوان کی طرح حسین۔ پھر بھی یہ کمبخت عورتیں کیوں اس پر اتنی جلدی فدا ہو جاتی ہیں۔ کیا اس دنیا میں ہم ہی جا تماگاندھی رہ گئے ہیں۔ آخر ہمارے پہلو میں بھی ایک حساس دل ہے۔ سوز، تڑپ، شعریت سب کچھ ہے۔ مگر اس پر بھی سب

ہم ایک گھٹن جگر سمجھتے ہیں۔ آخر یہ تفاوت کیوں۔ ؟ جگدیش میں ایسے کون سے لعل لگے ہیں۔ موٹی موٹی آنکھوں پر عینک چڑھا کر مرغے کی طرح چھاتی نکال کر چلنے سے کون سے سرخاب کے پر لگ جاتے ہیں۔ وہ چڑیل اوشا بھی اس پر مرتی تھی۔ کمبخت! یونہی سوچتے سوچتے، دل ہی دل میں کڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کہ یکایک سامنے سے ایک دلکش ہنسی اور پھر ایک بلند قہقہے کی آواز سنائی دی آنکھ اٹھا کر دیکھا تو سامنے کے ٹیلے پر سے جگدیش اور ذی شی چلے آ رہے تھے۔ دونوں نے لمبے سموری فرغل پہن رکھے تھے۔ دونوں کے سروں پر سموری ٹوپیاں تھیں۔ جن پر ایک طرف کو پیلے پیلے پھولوں کے گچھے بندھے تھے۔ جگدیش کا بلند قہقہہ مجھے بہت ناگوار گذرا۔

"اتنی دیر سوتے رہے۔ ؟" جگدیش نے سوال کیا۔ سوال کیا تھا۔ سراسر تضحیک تھی۔

"اتنی جلدی جاگ اٹھے۔ ؟" میں نے جواب دیا۔ جواب کیا تھا۔ سراسر طنز تھی۔

"نہانے چلے ہو۔ ؟" جگدیش نے پوچھا۔

"پاؤں کی موچ ٹھیک ہی ہو گیا۔ ؟" میں نے جواب دیا۔

ذی شی نے ایک دلکش قہقہہ لگایا، اور اپنا بایاں بازو میرے بازو میں ڈال کر کہنے لگی۔ "آؤ ہم تینوں دالیسا نندن سر کو چلیں۔" جب ہم نندن سر کو چلے تو جگدیش ذرا ٹھیک صاف کر رہا تھا۔ اور میں دل میں کہہ رہا تھا کہ اے پرفن حسینہ تو نے اس وقت تو ہم دونوں کو خوش کر دیا لیکن جلد یا بدیر تجھے اس امر کا فیصلہ کرنا ہو گا کہ تو دونوں میں سے کس کو چاہتی ہے۔ ؟

اور جلدی اس امر کا فیصلہ ہو گیا، میں ننددن سر پہ نہاتا رہا۔ اور وہ دونوں پھولوں کے تختوں میں نیم پنہاں خدا جانے کیا باتیں کرتے رہے، کبھی کبھی ہنس پڑتے پھر کان ہی کان میں ایک دوسرے کو کچھ کہتے، ایک دوسرے کی طرف پھول توڑ توڑ کر پھینکتے جگدیش نے خدا جانے اسے کیا کہا ذی شی یکا یک بھاگ اٹھی۔ جنگل کی مست ہرنی کی طرح، جگدیش اس کے پیچھے اٹھ کر دوڑنے لگا۔ ہاں واقعی پاؤں کی موچ نکل چکی تھی۔ پھولوں کے تختوں میں اس نے کئی چکر کھائے۔ مگر ذی شی کہاں اس کے قابو میں آئی تھی۔ اور اس کے لانبے لانبے سیاہ بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی پھولوں کے تختوں سے پرے ٹیلوں پہ سے چھلانگیں لگاتی ہوئی دور نکل کر نظر سے اوجھل ہو گئی۔ جگدیش بھی بھاگتا نظروں سے غائب ہو گیا۔ اب میرے سامنے صرف ممور کی دو ٹوپیاں پڑی تھیں اور پھولوں کے مسلے ہوئے تختے۔ یخ کی طرح سرد پانی نے جسم اکڑا دیا تھا۔ اور ہونٹ نیلے کر دیئے تھے۔ میں نہا کر بہت دیر تک دھوپ تاپتا رہا۔ آج گرجن دیوتا کی چوٹی پہ بادلوں کا نشان بھی نہ تھا۔ میں پہاڑ پہ اس سلوٹ کو ڈھونڈنے رہا جس کے اندر خیمہ تھا۔ لیکن وہ سلوٹ یہاں سے نظر نہ آتی تھی۔ جگدیش اور ذی شی کہاں گئے۔ یہ سوچکر میرا منہ لال ہو گیا۔ اب تو گرجن کو ہی اپنی قیام گاہ بنانا ہو گا۔ آج ریوا کو کہنا ہو گا۔ مزدوروں کو ساتھ لیکر جائے اور خیمہ اور دیگر سامان اٹھوا کر یہاں لے آئے۔ اس برفانی سلوٹ سے یہ تنگ کی بستی زیادہ محفوظ جگہ ہے اور اگر کل کی طرح ایک اور ایسی ہی برفانی اور طوفانی شام آ گئی تو گرجن دیوتا کی بدنامی پوری ہو جائیگی۔

اب بدن اچھی طرح سے گرم ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں غنودگی سی آنے لگی تھی۔ دماغ میں جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر کپڑے پہنے اور چلنے لگا۔ راستے میں پھر مجھے جگدیش اور ذی شی مل گئے۔ ذی شی کے رخساروں کی لالی بڑھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں نیچی تھیں۔ جگدیش کی چھاتی ضرورت سے زیادہ باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ ایک نئے بھرتی شدہ لفٹننٹ کی طرح اس بار ذی شی نے چلتے چلتے میرا ہاتھ نہیں پکڑا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا۔ بیٹا صبر کرو۔ روتے دھونے سے کیا ہوتا ہے۔ ایسے کئی چرکے تم کھا چکے ہو۔

گرجن میں زندگی ایک سپنے کی طرح گذرتی ہے۔ اس سپنے میں ریشمیں گھاس کے بے شمار قطعے ہیں۔ ان قطعوں کے اندر کہیں کہیں تنگ کے درخت ہیں۔ ان تنگ کے درختوں کے نیچے گڈریئے اور ان کے ریوڑ رہتے ہیں۔ دن بھر ریوڑ سبزے کے قطعوں میں گھاس چرتے ہیں۔ کودتے ہیں۔ ناچتے ہیں۔ میں میں بَاَبَا کرتے ہیں۔ کبھی ناکام رہتے ہیں تو ایک دوسرے کو سینگ مار مار کر لہو لہان کر دیتے ہیں۔ گڈریئے مینڈھوں کو لڑاتے ہیں۔ شرطیں بدتے ہیں۔ ہارتے ہیں۔ جیتتے ہیں الغوزے بجاتے ہیں۔ تسکنجہ کھیلتے ہیں۔ پھر جب شام ہو جاتی ہے اور مغربی افق کی آخری لال دھاری تاریکی میں گم ہونے لگتی ہے تو ریوڑوں کو واپس تنگ کے درختوں تلے لے آتے ہیں۔ الاؤ کے ارد گرد بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے میں دودھ شامل ہوتا ہے اور مکھن اور مکئی کی روٹی۔ کبھی نمک یا گڑ یا نیچے کی بستیوں سے کبھی کبھی پیاز اور سرخ مرچیں

بھی آجاتی ہیں۔ ورنہ اکثر وہی دودھ اور مکئی کی روٹی دہی اور مکھن، پنیر، گرجن میں ہر
چرواہے اور چرواہی کے جسم سے پنیر کی سوندھی سوندھی بو آتی ہے۔ جو اکثر شہری طبیعتوں
کو بہت بری معلوم ہوگی۔ پسند اپنی اپنی، غازہ اور پوڈر اور لپ سٹک کی جگہ چرواہیاں
یہی دودھ مکھن استعمال کرتی ہیں۔ تیل کی جگہ بھی مکھن یہاں مٹی کے برتن بہت کم ہوتے
ہیں۔ دودھ کھالوں دودھ کر رکھا جاتا ہے۔ دودھ دوہتے وقت چرواہیاں شرطیں
بدتی ہیں۔ کس کی بکری زیادہ دودھ دیتی ہے۔ کون زیادہ دودھ کی دھاریں اپنے منہ
میں ڈال سکتی ہے۔ نیم گرم دودھ کی تازہ دھاریں جب پیاسی زبان سے جالگتی ہیں۔ تو
دل کو وہ فرحت نصیب ہوتی ہے کہ چائے اور کوکو سب بھول جاتے ہیں۔ میرے خیال
میں زندگی کا بہترین مصرف یہ ہے کہ آدمی بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک نگ کے
درخت کے تلے رہے۔ بکریاں چرائے۔ الغوزے بجائے اور تازے دودھ کی دھاروں
سے مشام جان کو ہر دم تازہ رکھے۔ دودھ سے مکھن نکالنے کا طریقہ بھی بہت عجیب
ہے۔ یہاں نہ مٹی کی مٹکی ہے۔ نہ بلونا۔ بس ایک کھال میں اس کے نصف حجم کے برابر
دودھ ڈال دیا جاتا ہے۔ اور ایک چرواہی اس کھال کو اچھی طرح سے بند کر کے ایک
بچے کی طرح گھاس پر لٹا دیتی ہے۔ اور پھر جس طرح آٹا گوندھا جاتا ہے۔ اس طرح
کھال کو اپنے ہاتھوں سے بار بار گوندھتی ہے۔ لٹیں بکھری ہوئی ہیں۔ چہرہ لال ہے۔
آنکھوں میں چمک ہے۔ زبان پر کوئی پہاڑی گیت ہے اور کھال گوندھے جا رہی ہے۔
کوئی ایک آدھ گھنٹہ کے بعد کھال کے اندر دودھ اور مکھن الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

دودھ الگ دوسری کھال میں ڈال لیا جاتا ہے۔ اور مکھن ہاتھ سے اتار لیا جاتا ہے بود نہ خالص گھی ہوتا ہے اور گاڑھا بھی۔ اس دودھ میں پانی کم اور مکھن زیادہ ہوتا ہے اور جب پیو تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا شیریں مکھن کا سیال ہے کہ گلے میں اترتا جا رہا ہے۔ اس دودھ کو پی کر نیند بہت آتی ہے۔ ساری زندگی ایک سپنا معلوم ہوتی ہے۔ اور در اصل گرجن ہے بھی ایک سپنا ہی۔ ورنہ ایسے ایسے مقام تو اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اب تو دنیا تلخ حقیقتوں سے بھری جا رہی ہے۔ نقلی دودھ اور نقلی محبت اور نقلی انسانیت اور پھر زندگی کارخانے سے گھر کے گندے صحن میں اور گندے صحن سے کارخانے کے گندے در کتاب تک محدود رہتی ہے۔ اس زندگی میں بچے پیدا ہوتے ہی بوڑھوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ لیکن گرجن میں ابھی تک ہر بوڑھا اور نوجوان بچپن کی معصومیت لئے ہوئے ہے۔ الاؤ کے چٹختے ہوئے کوئلوں کی مدھم روشنی میں چرواہیاں اون سے کچھ بن رہی ہیں۔ تکلی گھوم رہی ہے۔ ان کی باہیں اور چہرے اور آنکھیں ایک خاص ترتیب سے حرکت کرتی ہیں، جیسے یہ مکھن کی پتلیاں ہیں۔ ایک چرواہا کہانی سنا رہا ہے۔ ریمی کی کہانی تم نے سنی ہے۔ ریمی گرجن کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ وہ تنگوں کے سایوں میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ اور نندن سر کی نیلی جھیل کا عکس اس کی دلکش آنکھوں میں چمکتا تھا۔ اس کی جبیں گرجن کی برف کی طرح سپید تھی۔ اور ڈوبتے ہوئے سورج نے اس کی گالوں کو چوم کر انہیں ایک جادوئی چمک عطا کی تھی۔ ایسی لڑکی کسی دیوتا ہی سے بیاہنے کے لائق تھی کسی چرواہے کو اس

سے محبت کرنے کی جرات نہ ہونی چاہئے تھی۔ گرجن دیوتا کا سایہ اس پر تھا۔ وہ اکثر دن بھر اکیلی گھومتی تھی۔ کبھی کبھی وہ بے خوف و خطر گرجن کی سب سے اونچی چوٹی پر چلی جاتی۔ شاید اس نے دیوتا کے درشن کرلئے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کو بہت پیاری لگتی۔ لیکن افسوس وہ جان بوجھ کر موت کے منہ میں جارہا تھا۔ اسے کئی بار سمجھدار بوڑھے چرواہوں نے سمجھایا۔ لیکن وہ نہ مانا۔ گرجن دیوتا نے بھی اسے کئی بار سمجھایا۔ کہانی سنانے والے چرواہے کو معلوم تھا کہ ایک بار داٹو کو لک سر کی گھاٹی میں گرجن دیوتا ملے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ اور گھاٹیاں اور چوٹیاں اور میدان ایک روپہلی خاموشی میں کھوئے ہوئے تھے۔ نہ ہوا تھی، نہ نغمہ، نہ بادل اور اس خاموش بے حس و حرکت کائنات میں صرف دو دل دھڑک رہے تھے۔ ریمی اور داٹو۔ داٹو اور ریمی اور داٹو نے جرات کرکے ریمی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ عین اسی وقت داٹو کو سامنے ایک سپید برف کا گولا ہوا میں اڑتا ہوا نظر آیا۔ اس نے گھبرا کر ریمی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ گولا ہوا میں اڑتا ہوا آسمان کی طرف پرواز کرنے لگا۔ اور پھر اس کے سامنے زمین سے آسمان تک برف کی ایک لکیر سی کھنچ گئی تھی۔ ریمی کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ سپید۔ اور داٹو اس لکیر کو دیکھ کر کانپنے لگا۔ لیکن وہ ریمی کی محبت سے دست بردار نہ ہوا۔ گرجن دیوتا نے اسے ایک بار پھر سرزنش کی۔ کہانی سنانے والے چرواہے کو معلوم تھا کہ کس طرح داٹو کو گرجن دیوتا نے رات بھر طوفان میں گھیرے رکھا تھا۔ داٹو کو اس بھیانک رات میں کبھی کبھی گرجن دیوتا کی خشمگین آواز سنائی دیتی۔

"ریمی کی محبت سے باز آ، ریمی تیری نہیں ہو سکتی۔" کبھی کبھی اسے بھیڑ بکریوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ کبھی کبھی کوئی جلتا ہوا الاؤ کسی ٹنگ کے نیچے نظر آجاتا۔ لیکن یہ سب گرجن دیوتا کے کرشمے تھے، وہ رات بھر طوفان میں گھرا رہا، اور جب دوسرے دن وہ گھر پہنچا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی اور اس کے پاؤں کے انگوٹھے ہمیشہ کے لئے نیلے ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ شدت سے ریمی سے محبت کرتا رہا۔

"پھر کیا ہوا۔ ؟" ایک چرواہی نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

بس گرجن کی کہانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان میں محبت ہوتی ہے۔ بچپن کے ہوائی قلعے معصوم توہمات اور قدرت کے ہیبت ناک مناظر۔ ان کہانیوں میں نہ فن کاری ہوتی ہے۔ نہ عروج، نہ پلاٹ، گڈریا جو جی میں آئے کہتا چلا جا رہا ہے۔ کہانی آپ ہی آپ بنتی جا رہی ہے۔ جیسے ریشم کے کیڑے کے منہ سے ایک خوبصورت کویا تیار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہانی کہنے والے کی زبان کھلتی چلی جا رہی ہے اور کہانی تیار ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کہانی اس کہنے والے نے بھی پہلے کبھی نہیں سنی۔ اسے خود نہیں معلوم "پھر کیا ہوا۔" وہ کہانی کہتا چلا جا رہا ہے اور رات کے سناٹے میں۔ الاؤ کی روشنی میں، اون بنتی ہوئی چرواہنوں کے جھرمٹ میں واٹو اور ریمی کے حسین پتلے تخیل کے شبستان میں اجاگر ہو رہے ہیں۔

لیکن ریوا کو شاعری سے دلچسپی نہیں۔ وہ کہانیاں سننا نہیں چاہتا۔ اسے

اعتراض ہے کہ کیوں ہم نے پہاڑ کی بلندیوں کو چھوڑ کر پستی اختیار کی ہے۔ اس
کی شاہین کی سی نگاہیں شکار کی تلاش میں زیادہ خوشی محسوس کرتی ہیں۔ اسے یہاں کی
تتلیوں یا الغوزے بجاتے ہوئے گڈریوں۔ یا گرجن دیوتا کی ہیبتناک حرکتوں سے
ذرا بھی دلچسپی نہیں، وہ قدرت سے طوفان سے، موت سے ایک بہادر سپاہی کی طرح
مقابلہ کرنا جانتا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ اوشا کی بے وفائی نے میرے دل میں کیا آگ لگا
رکھی ہے۔ اور اب گرجن کی برفانی وادیوں میں ایک نئے الاؤ کے شعلے لپکنے لگے ہیں۔
وہ صرف ایک خوشبو کی تعریف کرنا جانتا ہے۔ جب وہ کبھی رولنے کو زخمی کر کے فوراً
اس کے نافے پر زور سے ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ نافے کی تھیلی پر سے خوشبو کی لپٹیں
نکلتی ہیں۔ ہرن جانکنی کی حالت میں ہے۔ زندگی نافے میں سے خوشبو کی لپٹیں بنکر
نکل رہی ہے۔ ریوا اپنے شکار پر جھکا ہوا ہے۔ نافے کو مضبوطی سے پکڑ کر اور اسے
چاقو سے چیر کر جسم سے الگ کر ڈالتا ہے۔ کہتے ہیں اگر نافے ہرن کا شکار کرتے ہوئے
فوراً ہی اس تھیلی کو نہ پکڑ لیا جائے تو سارا نافہ ہرن کے جسم کے اندر ہی جذب ہو
جاتا ہے۔ اور تھیلی میں ذرا سی بھی خوشبو نہیں رہتی۔ اور نافہ نافہ نہیں رہتا، بلکہ
محض چربی کی ایک پوٹ۔ ریوا صرف نافے کی تعریف کر سکتا ہے۔ چیڑ کی سوندھی خوشبو
سے اسے گھن آتی ہے۔ ذی شی کے بالوں۔ ذی شی کے کپڑوں اور ذی شی کے جسم میں
بھی میرے پیڑ کی سوندھی خوشبو سے اسے گھن آتی ہے۔ ذی شی کے بالوں۔ ذی شی کے
کپڑوں اور ذی شی کے جسم میں بھی میرے پیڑ کی سوندھی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ وہ یہ نہیں

سمجھ سکتا کہ جگدیش ایک صاحب ہو کر بھی کیونکر ذی شی سے عشق کر سکتا ہے۔ خود جگدیش
کو بھی اس نئے جذبے پر حیرانی سی تھی۔ اس نے اکثر۔ بلکہ ہم دونوں نے اکثر ـــــ پہاڑی عورتوں
سے عشق کیا تھا۔ اور یہ عشق ہمیشہ روپوں، چند حفاظتی تدبیروں اور دو ایک ریشمی رومالوں
پر مشتمل ہوتا تھا۔ کبھی ہم اسے شعری جذبہ کہتے تھے۔ کبھی وقتی شادی لیکن ہوتا یہ کچھ تھا۔
یعنی ننگ دیکھ لیا۔ دلشاد کیا، لیکن یہ کس بلا خیز طوفان کی آمد تھی کہ ذی شی کو دیکھتے
ہی جگدیش اس میں ایسا کھو جاتا تھا کہ سوائے ذی شی کے اسے دنیا کی کوئی اور چیز
اچھی نہ لگتی تھی۔ یہاں نہ جہیز کا سوال تھا۔ نہ تعلیم کا، نہ آداب کا اور ذی شی ان سب
باتوں سے بیگانہ تھی۔ پھر بھی جگدیش اس بیوقوفی پر تلا ہوا تھا۔ وہ ذی شی سے شادی
کرنا چاہتا تھا۔ شادی۔! سمجھتے ہو دوست۔؟ جگدیش اس لیے پاک پہاڑی لڑکی
سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ جس نے صوفے کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ جس کے باپ کے
پاس ایک گز زمین بھی نہ تھی جس کی انگلیوں میں چاندی کی انگوٹھی بھی نہ تھی۔ جس کے
اشعار وحشیانہ بندے کی طرح تھے۔ گرجن دیوتا اس سے زیادہ بد دعا اور کسی کو نہ دے
سکتے تھے۔ لیکن جگدیش بے بس تھا۔ میں اسے کئی بار سمجھاتا، پاگل ہوتے ہو۔؟ گرجن کی
زندگی خانہ بدوش گڈریوں کی زندگی ہے۔ لیکن انسان ایسی قبائلی زندگی سے بہت
آگے نکل گیا ہے۔ وہ ننگ کے درختوں تلے نہیں رہتا۔ بلکہ شہر بسا کر رہتا ہے وہ صرف
مکھن اور پنیر پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی کی صدہا لذتیں اسے میسر ہیں۔ ذی
شی پہاڑی لڑکی ہے۔ جب انول میں تمازتِ آفتاب سے فوراً جھلس جائے گی تم خود

اسے نفرت کرنے لگو گے۔ کیا سمجھتے ہو۔؟ جس نظام میں تم رہتے ہو۔ اس میں اس قسم کی عورت ایک دن بھی بمشکل گذار سکے گی۔ گھٹ کر مر جائے گی۔ شہری زندگی کا آسمان بہت تنگ ہوتا ہے۔ اور زمین بھی تپی تلی ہوئی وہاں نہ برفانی چوٹیاں ہوتی ہیں۔ نہ سبزہ زار ذی شی تو ایک عجائب گھر میں رکھے جانے کے لائق ہے۔ نہ کہ تمہاری بیوی ہونے کے لائق۔ اور پھر آج کل شادی میں محبت کو کیا دخل قبائلی زندگی میں محبت ہو سکتی تھی۔ لیکن موجودہ زندگی میں اور اس کے زمینی نظام میں محبت کو کیا دخل۔ اس دنیا میں ایک اونٹ کو سوئی کے ناکے سے گذارا جا سکتا ہے۔ لیکن محبت کے جذبے کو اس دنیا میں کیا داخل نہیں کیا جا سکتا۔ جب گرجن سے واپس جاؤ گے۔ اس وقت میری باتوں کی قدر معلوم ہو گی۔ اس وقت تمہیں اونشا یاد آئے گی۔ ذی شی تو سینما بھی تو نہیں دیکھ سکتی۔ کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ جب ہنسائی ہو گی۔ لوگ کہیں گے۔ جگدیش چڑیا گھر سے ایک جانور پکڑ لایا ہے۔ لیکن جگدیش بے بس تھا۔ شاید عمر میں پہلی بار اسے کسی سے محبت ہوئی تھی۔ وہ محبت چند روپوں چند حفاظتی تدبیروں اور دو ایک ریشمی رومالوں پر مشتمل نہ تھی۔ یہ کسی انوکھی آگ کا شعلہ تھا۔ جو اس کی روح کے ہر کونے میں کوندتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہ کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ اب جگدیش اور ذی شی اکثر اکٹھے رہتے تھے پہلے پہل ذی شی ہم تینوں کے ساتھ شکار کے لئے جاتی تھیں۔ اس نے بندوق چلانا بہت جلد سیکھ لیا تھا۔ اور کچھ دنوں سے تو وہ ایک مشاق شکاری بن گئی تھی۔ جس کی نگاہیں ریوا کی عقابی آنکھوں سے تیزی میں کچھ

ہوا کرتی تھیں. لیکن اب جگدیش اور ذی شی اکثر اکیلے شکار کو جاتے تھے۔ اور ریوا اور میں اکثر مخالف سمت میں جایا کرتے. لیکن کبھی کبھی کسی گھاٹی کی تنگنائے میں ہمارا میل ہو جاتا۔ وہ باہوں میں باہیں ڈالے چلے آرہے ہوتے۔ ان کے کاندھوں پر بندوقیں ہوتیں۔ جیپوں میں دن بھر کا شکار بنگاہوں میں ایک دوسرے کے لئے بے انداز محبت کبھی کبھی میں انہیں دن ڈھلے کسی گھاٹی کی اونچی چٹان پر کھڑے دیکھ لیتا۔ ان کی پشت میری طرف ہوتی۔ جگدیش کا ہاتھ ذی شی کی کمر میں ہوتا اور ذی شی کا سر جگدیش کے کندھے پر، بندوقوں کی سیاہ نالیں۔ درختوں کے تنوں کی طرح نظر آتیں۔ جس سے وہ سہارا لے کھڑے ہوتے۔ وہ نیچے ان وادیوں کی طرف تک رہے ہوتے۔ جہاں شام کی دھند پھیلتی جارہی تھی۔ اور سورج کا پگھلا ہوا سونا دھند کی سفید لہروں میں تیرتا ہوا نظر آتا. ساری فضا میں خاموشی ہوتی اور اس روپہلی خاموشی میں صرف دو دل دھڑک رہے ہوتے میں ان دلوں کا گیت سن سکتا تھا۔ یکایک ریوا بندوق سیدھی کرتا اور "ٹھائیں" کی آواز کے ساتھ ایک ہنولہ زمیں پر آگرتا۔ جگدیش اور ذی شی چونک جاتے جیسے ان کے سنہرے سپنے کے تار تھرا اٹھے ہوں۔ بندوق کی گرج گھاٹیوں میں بار بار گونجتی ہوئی پھیلتی جاتی جیسے گرجن دیوتا گرج رہے ہوں۔

جگدیش بے بس تھا۔ لیکن یہ جانتا ضرور تھا۔ کہ یہ محبت میدانوں میں پہنچنے کی نہیں۔ وہ اس سندر سپنے کو ابدی بنانا چاہتا تھا۔ لیکن سپنے آخر سپنے ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی فضا ہوتی ہے۔ ان کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ اور جب یہ ہماری دنیا سے ٹکراتے

ہیں تو پانی کے بلبلے کی طرح جھٹ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور آواز بھی نہیں آتی۔ کئی لوگ اس دنیا میں سندر سپنوں کو ابدی بنانا چاہتے ہیں سچی محبت، سچی انسانیت، سچی اخوت سچی مساوات...... پانی کے بلبلے ...... وہ اس دنیا کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ یہ چیزیں اس دنیا کی فضا میں نہیں پھول پھل سکتیں۔ ان کے لئے ایک نئی فضا کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے ہمیں اس ساری دنیا کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا ہوگا۔ اور ایک نئی دنیا آباد کرنا ہوگی۔ جگدیش جانتا تھا۔ کہ یہ کہنا آسان ہے۔ لیکن کرنا بہت مشکل۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جگدیش نے واقعی اپنے سندر سپنے کو ابدی کر لیا ہے۔ مجھے وہ طوفانی رات نہیں بھولتی۔ جب اسی تنگ کے درخت کے نیچے میں، ریوا اور بوڑھا لیونارڈ رات بھر جگدیش اور ذی شی کا انتظار کرتے رہے تھے۔ برفانی ہواؤں کے فراٹوں نے ریوڑ کو اس طرح اکٹھا کر دیا تھا کہ وہ سب غریب جانور ایک دوسرے کی تھوتھنیوں میں منہ چھپائے پڑے تھے اور کراہ رہے تھے۔ تنگ کے باہر طوفان گرج رہا تھا۔ اور بجلی کے پر پیچ حلقے زمین پر آگ کے بگولوں کی طرح چلتے نظر آتے۔ ایک جہنمی منظر تھا۔ جس میں بادلوں کی گرج۔ ہوا کی وحشیانہ چیخیں اور چوٹیوں پر سے گرتی ہوئی برف کے بھیانک قہقہے سنائی دیتے تھے۔ ریوا نے صبح سویرے ہی آنے والے طوفان کے متعلق ہم سب کو متنبہ کر دیا تھا۔ لیکن جگدیش اور ذی شی نے ہنس کر بات ٹالی دی تھی۔ ذی شی تو طوفان سے مطلق نہ ڈرتی

تھی۔ اور اس کے علاوہ اس دن وہ کسی رونے کا شکار کرنا چاہتی تھی۔ وہ نسے گرجن پہاڑ کی چوٹیوں پر گھوم رہے تھے۔ جگدیش اور ذی شی دونوں رخصت سفر باندھ کر شام کے لئے صبح ہی ان خطرناک بلندیوں کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ جہاں پہلے ہمارا کیمپ تھا اور میں نے اور دیوانے انہیں رومال ہلا ہلا کر الوداع کہی تھی۔

یہ آخری الوداع تھی۔ اس رات گرجن کے خوفناک دیوتا نے اپنے محبوب کو اپنی یخ بستہ چھاتی سے ہمیشہ کے لئے لپٹا لیا اور اپنے رقیب کے سینے میں دہکی بجلی گھونپ دی جو رات بھر آگ سے پیچ پیچ حلقوں میں گردش کرتی رہی تھی۔ یہ گرجن دیوتا کا انتقام تھا! دوسرے دن جب ہم چند اور گڈریوں کو ساتھ لیکر انہیں ڈھونڈنے کے لئے نکلے تو ہم نے انہیں پہاڑ کی بلندیوں پر ایک سلوٹ کے نیچے مردہ اور یخ بستہ پایا۔ جگدیش کی آنکھیں کھلی تھیں اور ذی شی کی آنکھیں بھی کھلی تھیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے دیکھتے مر گئے تھے۔ ذی شی برف پر لیٹی ہوئی تھی اور جگدیش اس کا سر اپنے زانو پر رکھے تھا۔ اور سلوٹ کے کناروں سے رات بھر پانی رستا رہا اور اس نے ان دونوں کے گرد ایک نیلم کی قبر بنا دی تھی۔ ذی شی کی آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ جیسے نندن سر کی جھیل اور جگدیش کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ ان کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے جگدیش کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا۔ آہ! ان گہرائیوں کا عالم کسی بے کس زخمی، سسکتے ہوئے آہو کی فریادوں کا آئینہ دار تھا۔ ہرن جانکنی میں تھا۔ اور زندگی نے میرے پیچھے چھوٹ

چھوٹ کر نکل رہی تھی۔ جب سُندر سپنے اس دنیا سے ٹکراتے ہیں تو پانی کے بلبلے کی طرح
چٹخ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔

تنگ کے دائرے سے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ الاؤ کے تنگ ہالے میں ریوڑ
سویا ہوا نظر آتا تھا۔ چرواہیاں تکلی پھراتی ہوئی اُون سے کچھ بُن رہی تھیں۔ چرواہے
محویت کے عالم میں ہاتھوں میں ٹھوڑیاں لئے ایک کہانی سن رہے تھے۔ کہانی سنانے
والا چرواہا کہہ رہا تھا۔ "بہت دن گذرے اس تنگ کے درخت کے نیچے ایک پہاڑی
بونا رہتا تھا۔ اس کی لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ اس کا نام تھا۔ ذی شی گرجن
دیوتا کی منظورِ نظر تھی۔ ایک دن کیا ہوا کہ اسی تنگ کے درخت کے سائے میں تین
شکاری آکر بیٹھے۔

ایک چرواہی نے سانس روک پوچھا۔ "پھر کیا ہوا۔؟"

٭

بالکونی

میں جس ہوٹل میں رہتا تھا اسے، فردوس، کہتے تھے، یہ ایک سہ منزلہ مکان تھا
اور چیل کی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ دور سے ہوٹل کے بجائے کوئی پرانا جہاز معلوم ہوتا تھا۔
میرا کمرہ درمیانی منزل کے غربی کونے پہ تھا۔ اور اس کی بالکونی میں سے گلمرگ کا گالف
کورس، نیڈوز ہوٹل، اور دیو دار کے درختوں میں گھرے ہوئے بنگلے، اور ان کے پرے
کھلن مرگ کا اونچا میدان اور اس سے بھی پرے الپتھر کی چوٹی صاف نظر آتی تھی۔
گلمرگ کی شفق مجھے بہت پسند ہے اور یہاں سے تو شفق کا منظر بہت بھلا معلوم ہوتا
تھا، اس لئے بھی میں نے اس کمرے میں رہنا پسند کیا۔ بہت سے لوگ جو یونہی بے
سوچے سمجھے کمرے کرایہ پر لے لیتے تھے، بعد میں میری بالکونی کی طرف بہ اندازِ
حسرت دیکھتے اور اکثر مجھ سے اجازت طلب کر کے میری بالکونی میں غروبِ آفتاب
کا نظارہ کرنے آیا کرتے، اس طرح ملاقات بہت سے ایسے لوگوں سے ہو گئی، جن کا
میں ابھی اس خط میں ذکر کرونگا۔ ان لوگوں میں بنیکر بھی تھے۔ اور تاجر بھی، ٹھیکیدار

بھی تھے، اور پانچ بچوں والی مائیں بھی۔ طالب علم بھی تھے اور طالب دیدار بھی، طرح طرح کے لوگ، مرہٹے، ایرانی، اینگلو انڈین، ڈوگرے، پنجابی، دہلوی، مختلف زبانیں مختلف لباس، عجیب عجیب باتیں، انوکھے تبسم، نرالے قہقہے، کائنات کی ساری بو العجبیاں اس بالکونی میں اکٹھی ہو گئی تھیں اور یہ سب عجیب لوگ غروب آفتاب کا منظر دیکھنا پسند کرتے تھے۔ یہ بڑے غیر رومانی لوگ تھے۔ ان کی زندگی کا نصب العین روپیہ تھا، لیکن یہ لوگ اکثر حالتوں میں دو ہزار میل چل کر گلمرگ کی شفق دیکھنے آئے تھے۔ مشینی دور میں ہر انسان روپیہ چاہتا ہے۔ سرمایہ داری نے اس کی زندگی کو تلخ اس کے دل کو کمینہ، اس کی روح کو غلیظ بنا دیا ہے۔ لیکن خوبصورتی کی حس ابھی مٹی نہیں، وہ انسان کی کائنات کے کسی گوشے میں کسی زخمی رگ کی طرح ابھی تک تڑپ رہی ہے، نہیں تو شفق دیکھنے کے لئے اس قدر بے قراری کیوں۔؟ وہ لوگ شام کو شفق دیکھتے تھے۔ اور میں ان کے چہروں کو دیکھتا تھا۔ وہی چہرے جوان میں پژمردہ، بھوکے اور خوفزدہ سے نظر آتے تھے۔ اس وقت کسی انجان، ان دیکھے نور کی تابانی سے چمکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، ان کے چہروں کی خباثت، اور آنکھوں کی مجرمانہ کیفیت، اک عجیب، پرسکون، سحر طراز مسرت میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ وہ اس شفق کو ایسی گزشتہ نگاہوں سے دیکھتے۔ جیسے بچے تصور میں اپنی پریوں کی شہزادی کے محل کو دیکھتے ہیں، اور وہ عورت جو پانچ بچوں کی ماں تھی۔ اور جس کے چہرے پر اس کے خانہ بدوش زندگی ظالمانہ بھوک نے جھائیاں پیدا کر دی تھیں۔ اپنے لٹے ہوئے حسن کو

دوبارہ حاصل کر لیتی تھی۔ اور اس وقت اس کے ادھ کھلے ہونٹوں کی چمک اور رخساروں کی پھبن اسے واقعی کسی پرستان کی ملکہ بنا دیتی تھی۔ یہ امر کسقدر مسرت زا ہے کہ انسان کے دل میں ابھی تک وہ اضطراری شعلہ تڑپتا ہے، اس کے دل کا شاعر اس کے تصور کا بچہ اس کے پرستان کی ملکہ ابھی تک زندہ ہے۔ اور جب تک وہ زندہ ہے انسان بھی زندہ ہے۔ سرمایہ داری، ظالم سماج، ملوکیت پرستی، فسطائیت دنیا کا ظالم سے ظالم نظام بھی اسے مٹا نہیں سکتا۔ میں انسان کے مستقبل سے نا امید ہوں۔

فردوس امیر سیاحوں کی نظر میں ایک گھٹیا، سستا سا ہوٹل تھا۔ لیکن میرے لیے پھر بھی مہنگا تھا۔

لیکن کیا کرتا کسی ہندوستانی ہوٹل میں جگہ خالی نہ تھی، ناچار یہاں آنا پڑا۔ فردوس میں جو لوگ اقامت پذیر تھے ان میں آدھے سے زیادہ مغربی تھے۔ اور باقی ایشیائی، بیرے ایک عجیب قسم کی زبان بولتے تھے، جو نہ انگریزی تھی۔ ہندوستانی، بلکہ دونوں کے ناجائز تعلق سے پیدا ہوئی تھی۔ کھانا چھری کانٹوں کے ساتھ کھایا جاتا تھا۔ لیکن اکثر چھریاں کند ملتیں، اور کانٹے غیر تلمیع شدہ، اور شوربے میں ہندوستانی کھانے کی طرح سرخ مرچوں کی اتنی بھرمار ہوتی کہ بیچاری لنکا شائر کی رہنے والی آیاؤں اور نرسوں کی زبان جلنے لگتی، اور وہ ہوٹل کے بیرے کو ایسی صلواتیں سناتیں کہ وہ خوشی سے اپنی چھاتی کا ابھار اور بھی بڑھا دیتا، بیرے کی مسرت کا راز یہ ہے کہ اسے جتنی گالیاں ملیں وہ اتنا ہی خوش رہتا ہے۔

اور بیرہ جتنا بڑا ہو۔ اسے اتنی ہی بڑی گالی چاہیئے۔ ورنہ وہ ناخوش رہے گا اور
دو ایک دن کے بعد اداس ہو کر ہوٹل سے چلا جائے گا۔ گالی اور بخشش بیرے کی
زندگی کے محور ہیں۔ کبھی اسے پہلے گالی ملتی ہے اور پھر بخشش، کبھی پہلے بخشش
بعد میں گالی۔ ہر حالت میں وہ خوش رہتا ہے۔ اور انگریزی سیاست کی سب سے
بڑی غلطی یہ ہے، کہ وہ اپنے بیروں سے ہندوستانی قوم کا اندازہ کرتے ہیں۔
وہ پوری کی ہندوستانی قوم سے اپنے بیروں کا سا سلوک کرتے ہیں اور چاہتے ہیں
کہ ہندوستانی بھی ان سے ان کے بیروں کی طرح خوش رہیں اب ان ہندوستانیوں
کی کور ذوقی کا کیا کیا جائے، کہ وہ کسی حالت میں بھی مطمئن نظر نہیں آتے۔ نہ
وہ گالی پسند کرتے ہیں نہ بخشش۔

ہوٹل کا منیجر ایک مسلمان کشمیری تھا۔ نام تھا احمد جُو۔ دُبلا پتلا کشمیری
بی۔ اے پاس، لبوں پہ ناامیدی کی راکھ، آنکھوں میں ان تمام خوابوں کی
حسرت جو پورے نہ ہوئے، چالیس روپے تنخواہ، ہوٹل کا مالک ایک بڈھا تھا۔
جس نے یہ ہوٹل بڑی محنت سے جنگل سے لکڑی چرا چرا کر بنایا تھا۔ خود چور تھا۔
اس لئے اپنے ہوٹل کے منیجر کو بھی چور سمجھتا تھا۔ ہر روز بلا ناغہ فردوس کے حساب کتاب
کی پڑتال کرتا۔ دودھ، مکھن اور شہد اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا۔ بلکہ اس پر بھی اس
کی تسلی نہ ہوتی۔ مزید نگرانی کے لئے اس نے ایک سکھ نوجوان کو بھی ملازم رکھ لیا۔ اور
اب پاکستان اور خالصتان ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوئے ایک دوسرے سے

خائف ہونے لگے۔ نگرانی سے ایمان میں خود بخود فرق پیدا ہونے لگا۔ سیدھی باتوں میں
فریب نظر آنے لگا۔ دل خود بخود بددیانتی کی طرف مائل ہونے لگا۔ ہر وقت، ہر طرف
سے شکوک و شبہات کا طوفان اُمڈتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ آنکھوں کی خوبصورتی
اور معصومیت زائل ہو گئی۔ اب آنکھیں کنکھیوں سے دیکھنے کی عادی ہو گئیں۔ دل اپنے
غصے کو اور اپنے دشمن کو قتل کر دینے کی جائز تمنا کو ایک چھوٹے بے خبر نظری تبسم میں چھپانے
لگا۔ ہوتے ہوتے یہ نگہداشت اس حد تک بڑھ گئی کہ منیجر اور مخبر سائے کی طرح ایک
دوسرے کا پیچھا کرنے لگے۔ اور ہوٹل کا سارا انتظام بڈھے بیرے کے ہاتھوں میں چلا
گیا۔ ہندوستان کی تاریخ فردوس میں بھی اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔

بڈھا بیرا ہر وقت مسکراتا رہتا تھا۔ خاص کر بخشش کے وقت تو اس کی عجیب
حالت ہوتی تھی۔ اس وقت مجھے وہ وزن ناپنے والی چھتری دار مشین یاد آجاتی۔
ادھر چھتری میں ایک آنہ ڈالا۔ ادھر کھٹ سے ٹکٹ برآمد۔ جس پر وزن لکھا ہوتا
تھا۔ بس یہی حالت بڈھے بیرے کی تھی۔ اُدھر آپ نے بخشش میں اٹھنی یا چونی
تھمائی۔ ادھر کھٹ سے تبسم حاضر۔ مجھے اس مسکراہٹ سے ایک گونہ عشق ہو گیا تھا۔
واللہ کس سرعت سے وہ تبسم کھلتی تھی۔ بجلی کی سی تیزی سے، وہ وزن ناپنے والی
مشین بھی تو اتنی جلدی کام نہ کرتی تھی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مشین آدمی سے زیادہ
تیز رفتار ہے۔ انہیں فردوس کے بڈھے بیرے کو دیکھنا چاہیے۔

فردوس کے بڈھے بہشتی کا نام عبداللہ تھا۔ عبداللہ ایک اجڈ کشمیری کسان

تھا۔ بدصورت، بے ڈھنگی چال۔ آنکھوں کے گرد بڑے بڑے حلقے، سرخ،
رخساروں پر نیلی وریدیں باہر ابھری ہوئیں۔ سامنے کے دانت غائب، عمر بھی کوئی
ساٹھ سال سے اوپر ہی ہوگی، عبداللہ کا ایک لڑکا تھا۔ باپ کے ہوتے ہوئے بھی
یتیم سا معلوم ہوتا تھا۔ عمر گیارہ بارہ برس، ہاتھ اور پاؤں سخت میلے، گھٹنوں تک
اونچا پاجامہ۔ قمیص کی بانہیں پھٹی ہوئیں۔ ہاں آنکھیں کنول کی طرح روشن تھیں۔ بڑی
بڑی آنکھیں اور معصوم چہرہ۔ بال بڑھے ہوئے اور پریشان، اور گردن پر میل کی تہیں۔
اک معصوم روح جو غریبی کے کیچڑ میں دھنسی ہوئی تھی۔ اور باہر نہ نکل سکتی تھی اور
مدد کے لئے چلا رہی تھی۔ اسے سب لوگ چھوٹا بہشتی کہتے تھے۔ عبداللہ اپنے بیٹے کو پیار
سے غریب کہا کرتا تھا۔ عجیب نام ہے غریب یہ نام سن کر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے
ہو جاتے ہیں۔ غریبی دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اور دنیا کے کسی باپ کو یہ حق نہیں
پہنچتا کہ وہ اپنے بیٹے کو غریب کہے، لیکن شاید عبداللہ ایک حقیقت بیان کر رہا تھا۔ وہ
اپنے بیٹے کو غریب کہے، لیکن شاید عبداللہ ایک حقیقت بیان کر رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے
کو "میرا راجہ بیٹا۔" کہہ کر اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکا نہ دینا چاہتا تھا۔

ہوٹل میں ایک اور بہشتی بھی تھا۔ یوسف شکل سے کنجڑا دکھائی دیتا تھا۔ بڑا
بدمزاج بہشتی تھا۔ ہر روز پیتا پھر بھی گالی کے بغیر کام نہ کرتا۔ اس کے علاوہ وہ چرس کا
کا دم بھی لگاتا تھا۔ اور عورتوں کی دلالی بھی کرتا تھا۔ یوسف چھوٹے بہرے کا بڑا دوست تھا
چھوٹا بہرہ ایک مسکین قسم کا انسان تھا۔ بےحد خدمت گزار "جی" کے سوائے اس کے منہ

سے کبھی کوئی اور کلمہ نہیں سنا۔ لب و لہجہ میں روغن قاز اس قدر گھلا ہوا تھا۔ کہ آدمی کے
بجائے بناسپتی گھی کا ڈبہ معلوم ہوتا تھا۔ اس قدر بھی خوشامد کیا۔ کہ ہر وقت ہاتھ جوڑ
رہے ہیں۔ مرے جا رہے ہیں۔ گفتار و اطوار میں اسقدر تملق اور چاپلوسی پیدا کر رہے
ہیں۔ جو ہر شریف انسان کے لئے بے حد شرمناک ہے۔ میں نے ایسا نرم گفتار، خوشامدی
پر فن انسان اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ یہ بھی عورتوں کا دلال تھا۔ لیکن صرف
انگریز عورتوں یا اینگلو انڈین چھوکریوں کی دلالی کرتا تھا۔ کبھی کبھار کسی ہندوستانی
فلم ایکٹریس کا کام بھی کر دیتا۔ اس کا نام تھا۔ کیا نام تھا۔ بھلا سا نام تھا۔ ذہن
میں پھر رہا ہے۔ زبان پر نہیں آ رہا۔ ہاں زمان خاں، زمان خاں! یہ نام میں اس
لیے لکھ رہا ہوں۔ کہ ممکن ہے۔ تمہارے دل میں کبھی اس قسم کی خواہش پھر جاگ
اٹھے اور تم فردوس میں جا اترو۔ ہاں تو زمان خاں کا نام نہ بھولنا۔ ایک ہی حرامی
ہے اس فردوس میں۔

اس جہاز نما ہوٹل کا حدود اربعہ نامکمل رہ جائیگا۔ اگر میں یہاں کے
ایک مستقل باشندے کا ذکر نہ کروں۔ یہ ایک ادھیڑ بڈھا تھا۔ اور پچھلے دس سال
سے گلمرگ کے اسی ہوٹل میں مقیم تھا۔ بلّی داڑھی، آئین شٹائن کا سا سر، ویسے ہی الجھے
ہوئے بال۔ ویسا ہی فراخ ماتھا۔ ہاں ہونٹوں اور ناک کی تراش یہودیوں کی سی نہ
تھی۔ ناک کے دائیں نتھنے پر ایک چھوٹا سا مسّا تھا، جو اس کے چہرے کی فراست
کو اور بھی نمایاں کر دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے رنگ کا میں کبھی ٹھیک طور سے

اندازہ نہ کر سکا۔ کبھی تو وہ آسمان کی پہنائیوں کی طرح نیلی معلوم ہوتیں۔ اور کبھی کسی پرانی ٹھہری ہوئی جھیل کی گہرائیوں کی طرح سبز دکھائی دینے لگتیں۔ اور پھر اس کے چہرے پر کسی نامعلوم سے دھندلکے کا غبار ہر وقت چھایا رہتا۔ اس لطیف دھند کی طرح ہلکا سا جو اکثر میرے کمرے میں گلمرگ کے بادلوں سے چھٹ کر بھاگتی ہوئی آجایا کرتی۔ اوبرائن کا چہرہ (بڈھے کو سب ہی اوبرائن کہتے ہیں۔) کبھی تو اس غبار میں بالکل روپوش ہو جاتا۔ اور کبھی یہ غبار اس قدر لطیف ہو جاتا، کہ اس کے دھندلے دھندلے خدوخال کے نیچے اس کی زندگی کا استہزائیہ انداز صاف صاف عیاں ہو جاتا۔

اوبرائن خوب پیتا تھا، اور ہمیشہ بڑھیا شراب پیتا تھا۔ اور جب مخمور ہوتا تو بہت عمدہ باتیں کرتا تھا۔ شگفتہ انداز، سلجھے ہوئے فلسفیانہ فقرے۔ طنزیہ بیان جن میں ایک انفرادی تجربے کی ساری گہرائی پنہاں ہوتی، وہ کبھی تو گھنٹوں باتیں کرتا اور کبھی گھنٹوں چپ رہتا۔ اسے نہ شکار کا شوق تھا نہ عورتوں کا، اور عجیب بات یہ ہے کہ گوشت بھی نہ کھاتا تھا۔ ہاں پنیر سے اسے بہت رغبت تھی۔ کہتا تھا کہ پنیر کے ایک ٹکڑے پر میں دس دن زندہ رہ سکتا ہوں، تم ابھی بچے ہو۔ جب میری عمر کو پہنچو گے تو معلوم ہوگا کہ عورت کے شباب میں بھی وہ تازگی نہیں ہے جو اس پنیر کے ٹکڑے میں اور اس بادۂ ناب کے ایک قطرے میں، پیو، پیو، اور پیو، اور اس گلمرگ کی شفق کو دیکھو، جس کے لیٹے ہوئے خون میں اس وقت مغربی افق کا حسن دوچند ہو گیا ہے ...... اوبرائن فردوس کا فلسفی ہے۔ اگر کبھی گلمرگ جاؤ تو اس سے ضرور ملنا۔

وہ زندگی کے ان حقائق کو بیان کرتا ہے۔ جنہیں اس نے اپنی حیات کے زخموں سے نچوڑا ہے۔ اس کا بیان ایک تلخاب ہے اک رستا ہوا زخم ہے، اک خوفناک زہر کا دھارا ہے۔ لیکن اس زہراب کی لہروں پر ایک ایسے ہلاکت آفریں تبسم کا سایہ ہے کہ تم اس سے مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکو گے۔...... اور اگر سچ پوچھو تو ابھی تک زندگی میں اس کے سوا اور ہے بھی کیا۔؟

عبداللہ کے بیٹے کو لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اُردو کا قاعدہ ختم کر چکا تھا، اور اب اُردو کی پہلی کتاب پڑھ رہا تھا۔ جس کے پہلے صفحہ پر اس کا باپ حقہ پی رہا تھا۔ عبداللہ کو جب بھی فرصت ملتی، وہ اپنی کوٹھری میں جاکر حقہ پیتا، یا کبھی کبھار جب مجھے فرصت ملتی تو بالکونی میں آن بیٹھتا۔ اس کا بیٹا مجھ سے سبق لیا کرتا، اور عبداللہ اپنی زندگی کی رام کہانی سناتا، یہ کہانی اس نے ٹکڑوں میں، قاشوں میں، آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے درمیان، نہانے کے ٹب کے پاس کھڑے ہو کر، کھانستے ہوئے، دمے کے عارضے سے جنگ کرتے ہوئے سنائی تھی۔ یہ کوئی بڑی رومانی داستان نہ تھی، کوئی بڑی المناک داستان نہ تھی، ایک سیدھے سادھے دہقان کی زندگی تھی۔ چند خوشیاں تھیں، اور اَن گنت آنسو۔ وہ ایک کسان تھا۔ چند بیگھے زمین تھی۔ جوانی میں اس نے محبت بھی کی تھی، شادی بھی کی، چند سال بہت بھلے معلوم ہوئے، زندگی کا رقص سہانا تھا۔ معصومیتیں آئیں۔ لیکن شباب کے تازہ خون نے انہیں دھو دیا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد اس نے گاؤں کے مہاجن کا قرضہ چکایا۔

اور کھیتوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے مختلف طریقے سوچنے لگا۔ اپنے کھیتوں کا
ایک حصّہ اس نے پھلدار درختوں کی کاشت کے لئے الگ کر دیا۔ دل میں امنگیں تھیں
چاہتا تھا کہ وہ معمولی کسان نہ رہے۔ دیہات کا ایک متمول زمیندار بن جائے امارت
حاصل کرنے کے لئے اس نے مہاجن سے قرض لیا۔ لیکن متواتر دو سال برف و باراں کا یہ
عالم رہا کہ پلنے پنپ نہ سکا، پھر قحط پڑا، زمین بک گئی، بڑا لڑکا مر گیا، بیوی بھی اسی قحط
کی نذر ہو گئی۔ وہ اپنے چھوٹے اور آخری بچے کو اپنی چھاتی سے لگائے دیس بدیس گھوما، رخساروں
کا رنگ اڑ گیا۔ آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی۔ وہ کانوں پر کوئلہ اٹھاتے اٹھاتے دمے کی [illegible]
ہو گئی۔ اب کھانسی ہوتی ہے گلے میں بلغم پھنس جاتا ہے، گلا رندھ جاتا ہے۔ آنکھیں پھٹی پڑتی ہیں
پورے چھ سال اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد اپنے وطن واپس آیا، کیونکہ وطن کی مٹی ہر بھٹکی ہوئی
روح کو ہر وقت واپس بلاتی رہتی ہے۔ اب چھ سال سے وہ اسی ہوٹل میں نوکر ہے غنیمت ہے یہ
زندگی، اللہ کا شکر ہے صاحب، دو وقت روٹی مل جاتی ہے۔ صاحب انعام بھی دیتے
ہیں۔ یہ میرا یتیم بچہ ہے، غریب، خدا اس کی عمر دراز کرے، یہاں اسی طرح پڑا
رہیگا، تو بہشتی کے سوا اور کیا بن سکے گا۔ دو چار حرف پڑھ جائیگا تو زندگی سنور جائیگی
خدا آپ کو اس کا اجر دے۔ میرے غریب کو سبق بتائیے۔ اچھا میں اب چلتا ہوں۔ ذرا
صاحب کے نہانے کے لئے پانی رکھ آؤں۔"

اُف کس قدر بے حیا ہے یہ خدائی، کیسی معمولی سی زندگی ہے، اب کن توقعات
پہ دی ہے، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں آدمیوں کی یہی زندگی ہے۔ ہر ملک میں ہر قوم میں

کرۂ ارض کے ہر حصے میں، چند ایک افراد اور جماعتوں کو چھوڑ کر ہم سب کو اپنی تہذیب پر، اپنے مذہب پر اپنے کلچر پر، اپنی سوجھ بوجھ پر اپنی فراست پر ناز ہے، یہ ہیکڑی یہ رعب، یہ ملمع سازی!....... انسان کے جھوٹ اور خود فریبی کی کوئی حد نہیں ہے۔

اور عبداللہ کو دیکھئے کہ ناخوش ہے، کھانس رہا ہے، پھر بھی جئے جا رہا ہے، اسے امید ہے کہ اگر دنیا نے اسے پنپنے کا موقع نہیں دیا، اگر سماج کے قہر نے اس کی زندگی کی ساری راحتوں اور مسرتوں کو اس کی آنکھوں کے سامنے گلا گھونٹ کر اسے یوں ترسا ترسا کر مار ڈالا۔ تو اب یہی سماج، یہی دنیا، یہی نظامِ حیات، اس کے بیٹے کو پنپنے کا موقع دیگا، لیکن عبداللہ آخر انسان ہے۔ کشمکشِ حیات اس کی گھٹی میں ہے، لڑے جاتا ہے۔ مرے جاتا ہے۔ شاباش بیٹا، لڑے جا، مرے جا، ایک دن تیرا بیٹا جوان ہوگا، اس کی لہکتی ہوئی امنگوں کی کامرانی میں تو پھر زندہ و جاوید ہوگا۔ اس کے شباب کی تازگی میں اس کے حسن و عشق کی رنگین داستانوں میں اس کے جذبۂ مسرت کی سربلندیوں میں تیری روح اپنے آپ کو پالے گی۔

بالکونی کے ملاقاتیوں میں سے ایک خوش شکل جوڑے کی یاد اب بھی دل میں باقی ہے، دونوں نوجوان تھے، خوبصورت اور پڑھے لکھے نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اسی لئے گل مرگ میں ہنی مون منانے آئے تھے۔ اسی لئے گل مرگ دیکھنے کے بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے میں زیادہ مصروف رہتے تھے، لڑکا لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا۔ "جانِ من یہ شفق کس قدر خوبصورت ہے۔" اور لڑکی اپنا نرم ہاتھ اس کے کندھے سے چھو کر کہتی،

اور یہ پھولوں سے مہکی ہوئی فضا، ہائے میں تو مر جاؤں گی......بس یہ دونوں دن
بھر مرتے رہتے تھے۔ شفق پہ مر رہے ہیں۔ پتنگوں پر مر رہے ہیں، گلاب کو دیکھ کر مر رہے
ہیں، چاندنی پر مر رہے ہیں، دیودار کے درختوں سے لیکر پہاڑی ٹٹوؤں پر مر رہے ہیں۔
بعد میں یہ بھی معلوم ہوا، کہ یہ دونوں دن بھر تو مرتے رہتے ہیں اور رات بھر جاگتے
رہتے ہیں، اتفاق سے ان کا کمرہ میرے کمرے کی چھت پر تھا، تیسری منزل پر، بس رات
کو کبھی گلاس ٹوٹنے کی آواز آتی تھی، کبھی چارپائی اوندھی ہو جاتی، کبھی بلیاں غراتی تھیں۔
اور پائین کا خیال تھا کہ دونوں ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس الف لیلیٰ کا
خواب کی حد پر حقیقت کا آسیب بھی رہتا ہے۔

میں نے کہا۔ "بڈھے تیری عقل ماری گئی ہے۔ کیا شادی کرنا برا ہے شادی
ہوتی ہے، بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اس خواب سے انسانوں کی سہانی بستی میں ایک نئے
گھر کا اضافہ ہوتا ہے۔

اور برائن کہتا۔ "شادی بری نہیں خواب کا ٹوٹنا برا ہوتا ہے۔ اور یہ سپنے
بہت جلد ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ قدرت اپنے دام بچھاتی ہے۔ اسی لئے تو اس نے پھولوں
میں خوشبو، ہرن میں کستوری اور عورتوں میں رعنائی رکھی، اور جب قدرت کا مقصد
پورا ہو جاتا ہے۔ تو پھول مرجھا جاتے ہیں، ہرن شکار ہو جاتے ہیں، عورتیں بوڑھی
ہو جاتی ہیں، اور تمہارے سپنے ٹوٹ جاتے ہیں۔"

"جس طرح رات کو میرے ہاتھ سے شیشے کا گلاس ٹوٹ گیا تھا۔"

لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ اور کنکھیوں سے اپنے محبوب کو دیکھنے لگی۔ دونوں نے کسی ایسے دلچسپ واقعے کو اپنی نگاہوں میں دہرایا، جس کی حیثیت اس وقت قندِ مکرر کی سی ہو گئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا۔؟"

وہ دونوں ہنسنے لگے، لڑکی بولی۔ "رات کا وقت تھا، گلاس ٹوٹ گیا اور پانی فرش پر بہہ نکلا۔ فرش لکڑی کا تھا اور نیچے آپ کا کمرہ تھا۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو یوں کہئے، خیریت ہوئی، میرا بستر ذرا ایک طرف تھا.... ہاں کمرے کی دری ابھی تک گیلی ہے۔"

"آہ۔! ڈارلنگ، دیکھو وہ چڑیا کتنی خوش رنگ ہے" لڑکی نے مجھے ٹوٹے ہوئے گلاس کی طرح بے کار سمجھ کر اپنے شوہر سے کہا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ دباتے ہوئے بالکونی سے باہر دیکھنے لگے۔

ادبرائین بولا۔ "حسن ابدی نہیں ہے۔ بس مجھے کائنات اور اس کے بنانے والے پر رہ رہ کر یہی غصہ آتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے۔؟"

میں نے کہا۔ "کون کہتا ہے ابدی نہیں ہے، تم حسن کو انفرادی حیثیت سے دیکھتے ہو بخت رجعت پسند ہو تم۔ حسن کو اجتماعی حیثیت سے دیکھو، پھول ہمیشہ مسکراتے رہتا زلفیں میں کستوری سدا مہکتی ہے۔ عورتوں کی رعنائی........" میں نے نوجوان لڑکی کی طرف دیکھ کر فقرہ ناتمام رہنے دیا۔ ادبرائین کی آنکھیں گہری سبز ہو گئیں۔

"اور پھر غور کرو۔ کہ حسن وقت کا ایک حصّہ ہے۔ اس کا جاپانی تازہ ہے جب تک وقت نہیں مرتا۔ حسن کیسے مر سکتا ہے۔ عورت اپنی لڑکی میں پھول اپنی کلی میں ہرن اپنے نافے میں اس حسن کو فرزداں دیکھتا ہے۔"

"اور عبداللہ اپنے بیٹے میں۔" اوبرائین نے طنز سے کہا۔

ہم بہت عرصہ چپ رہے، لڑکا اور لڑکی چلے گئے۔ پھر بھی خاموشی رہی، بیرے نے چائے رکھ دی، ہم دونوں خاموشی سے اسے پینے لگے۔ پہاڑوں پر دھند گہری ہوگئی تھی۔ گاف کورس پر بدلیوں کے نازک نازک ہاتھ بڑھتے ہوئے نظر آئے، بالکونی تک آپہنچے، ہمارے گالوں کو چھونے لگے۔ یہ نازک نازک ہاتھ......

بس گل مرگ میں مجھے یہی چیز پسند ہے، یہ لطیف لمس، یہ دھند کی سپید انگلیاں، اپنے گاؤں کا سا منظر ہے۔ اوبرائین اپنی پرانی یادوں میں کھو گیا۔

پھر یکایک کہنے لگا۔ "شراب کبھی بوڑھی نہیں ہوتی، بس یہی ایک چیز دنیا میں ابدی ہے......... میں نے ایک عورت سے محبت کی، اس نے مجھے ٹھکرا دیا۔ میں نے اپنی محبت کے نشے کو مدتوں تازہ رکھا۔ پھر یہ محبت بھی بوڑھی ہوگئی میں نے اسے جوان رکھنا چاہا، لیکن ہر لمحہ اس کے چہرے پر جھریاں پڑتی گئیں، ایک دن وہ بھی مر گئی۔"

"اور۔ وہ عورت۔"

"پتہ نہیں کہیں ہوگی، میں اب اسے دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں اپنے وطن واپس

جانا نہیں چاہتا۔ بیس سال پہلے میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ پیانو پر بیٹھی ہوئی اک دلفریب گت بجا رہی تھی۔ "ادیرا ئین" آہستہ آہستہ سیٹی میں وہ گت بجانے لگا۔ اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ باہر دھند میں وہ لڑکا اور لڑکی غائب ہو رہے تھے۔

فردوس کا عشق بڑا عجیب ہے، فردوس میں ہر اتوار کو ننگ مرگ سے نرسیں آتی تھیں، اور آیا لوگ اور ناشتہ کھلانے والی لڑکیوں کو ہر بدھوار کو چھٹی ملتی تھی۔ اسلئے فردوس میں بدھ اور اتوار کی رات کو کھانے اور پینے کے لئے خاص اہتمام ہوتا اول تو کھانا زیادہ تیار کیا جاتا، شراب زیادہ مقدار میں مہیا کی جاتی، اور پھر اسی دن گورے اور امریکی فوجی نجانے کہاں سے ٹپک پڑتے، بالکل بچوں کے سے چہرے ظاہری خشونت کے باوجود بھی مجھے وہ بے حد معصوم دکھائی دیتے۔ پتلونوں کی تراش، ٹوپی کے زاویئے، اور چھاتی کے پھیلاؤ کے باوجود یہ لوگ مجھے برے نہ لگتے، ان کے چہرے جیسے کچھ مانگ رہے تھے، جیسے کسی چیز کے متلاشی تھے، بھوکے تھے، پیاسے تھے، کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

یہ عشق حاصل کرنا چاہتے تھے، چنانچہ ان کی ضرورت زماں خاں جو فردوس میں عشق کا تاجر تھا۔ پوری کر دیتا۔ انداز یہ ہوتا۔

"ویل بیرا۔"

"یس سر۔"

"کیا بات ہے۔"

"سب ٹھیک ہے۔ ٹنگ مرگ میں نیا مس صاحب آیا ہے۔ لیکن صاحب اس کو صبح چار بجے ٹنگ مرگ میں میجر صاحب کے بنگلے پر حاضر ہونا مانگتا......"

"او سب ٹھیک ہے۔ ام کھود۔ تم نے، ام کھود پہنچائے گا۔"

ایک انداز یہ ہوتا۔

"ہیلو ڈارلنگ۔!" وہ کہتا۔

"ہیلو سوائن۔" (سور کے بچے) نرس کہتی۔

"کم آن۔"

"یو سٹوپڈ (تم احمق ہو)

"ڈونٹ بی سلی (بیاہل نہ بنو) کم آن۔" (اب آ بھی جاؤ)

Youar very cheexy

Shutup

اس خوبصورت اور حسین تعارف کے بعد دونوں دلدار کے جنگلوں میں بنفشے کے پھول جمع کرنے کے لئے تشریف لے جاتے۔

اوبرائن ان فاقہ مستوں کو معاف کر دیتا تھا۔ یہ بیچارے چند دنوں کے لئے چھٹی پر آئے تھے۔ اس کے بعد پھر جنگ پر جائیں گے۔ یہ فوجی ان چند دنوں میں اپنی جوانی سے سارا رس نچوڑ لینا چاہتے تھے۔ اپنے ارمانوں کی دنیا کو لوسل کی شہد آگیں لذت سے ہمکنار کر دینا چاہتے تھے۔ پھر اس کے بعد وہی رتیلے میدان

ہوں گے، وہی خندقیں، جنگلوں میں دشمنوں کی گھات۔

"میں سپاہی کو ہمیشہ معاف کر دیتا ہوں، وہ ایک عورت کی عصمت پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ تو ہزاروں عورتوں کی عصمت بچا لیتا ہے۔" اوبرائن کا یہ فقرہ مجھے اب تک یاد ہے۔ شاید اس وقت برما سے بھاگے ہوئے ایک ٹھیکیدار نے کہا تھا۔ "صاحب کس کی عصمت وعصمت یہ فلسفہ کھانا کھانے کے بعد سوجھتا ہے۔ اجی صاحب جب ہم برما سے بھاگے تو میرے ساتھ پورا خاندان تھا۔ بیوی تھی۔ نوجوان لڑکیاں تھیں، چھوٹے چھوٹے بچے تھے، سب راستے میں مر گئے، میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے بچوں کو اپنی بڑی کو روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے ترستے دیکھا۔ میری لڑکیاں پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے اپنی عصمت اس غربی سڑک پر بیچتی نظر آتی تھیں عصمت۔؟ الو کا پٹھا ہے۔ حرامزادہ ہے وہ جو عصمت کی تقدیس پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ سب فلسفہ پیٹ بھرنے کے بعد سوجھتا ہے۔"

وہ دیر تک اسی طرح بکتا جھکتا رہا۔ اوبرائن کے چہرے سے غبار چھٹنے لگا۔ کہنے لگا۔ "شراب منگاؤ۔ شراب، بس شراب کبھی بوڑھی نہیں ہوتی، شراب کبھی نامہربان نہیں ہوتی، شراب کبھی دھوکا نہیں دیتی، وہ انسان کی طرح ظالم نہیں ہے، خدا کی قسم، ابن مریم کی قسم وہ ہرگز ظالم نہیں ہے۔"

گہرے نیلے آسمان میں تارے چمکنے لگے۔ نیڈوز ہوٹل کی پہاڑی پر یکا یک بجلی کے قمقموں کی قطار روشن ہو اٹھی۔ ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے بنفشے کے پھولوں کی چھڑی فضا میں اچھال دی اور پھر چاند مغربی افق پر شفق کی آخری لکیر پر محجوب، شرمایا ہوا

برآمد ہوا۔ اس مہ وش ساقی کی طرح جس نے اپنے دستِ سیمیں میں پہلی بار مینا اٹھائی ہو۔
اور براؤن پینے لگا۔ اب اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ آسمان کی طرح صاف۔

پ

کمرہ نمبر سات میں ایک اطالوی بڈھا اور اس کی لڑکی میریا رہتے تھے۔ میریا دن
بھر اپنے کمرے میں پیانو بجاتی رہتی۔ اور شام کو اپنے باپ کے ساتھ سیر کرنے جایا کرتی۔ میریا
خدوخال میں ایشیائی مناسبت تھی۔ شاید اسی لئے میں اسے اس قدر پسند کرتا تھا۔ بڈھا
اطالوی یہاں پچیس تیس سال سے رہتا تھا۔ بازار میں اس کی ایک دوکان تھی۔ جہاں وہ
سامانِ خورد و نوش رکھتا تھا۔ کتابوں کی ایک چھوٹی سی لائبریری بھی تھی۔ جس میں زیادہ
تر جاسوسی ناول فحش قصے، بھتنوں کی کہانیاں اور اسی قسم کا ادب تھا۔ جو سپاہیوں کو
اور پڑھے لکھے امرا کو بے حد مرغوب ہے، وہ اس کی لائبریری سے کتابیں کرائے پر پڑھنے
کے لئے جاتے، بڈھے اطالوی کو چھڑی بنانے کا بہت شوق تھا۔ اور وہ جنگل کی لکڑیوں
سے ایسی خوبصورت چھڑیاں بناتا تھا۔ جو گل مرگ کی سوغات میں شمار ہوتی تھیں۔ اور
سیاح انہیں خرید کر بڑے شوق سے اپنے وطن لے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اسے
(Concetina) بجانے کا بہت شوق تھا۔ رات کو وہ کھانا کھا کر
(Concetina) کے ساتھ گایا کرتا اور میریا پیانو بجاتی۔ میریا پیانو بہت

اچھا بجاتی تھی۔ اور جنگ سے پہلے گل مرگ میں اکثر معزز انگریزی خاندانوں میں پیانو سکھانے جایا کرتی۔ جنگ شروع ہوتے ہی یہ دونوں باپ بیٹی حراست میں لے لیے گئے بعد میں جب انہوں نے اپنے ہندوستانی باشندے ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا تو چھوڑ دیئے گئے۔ پھر بھی ان پر کڑی نگرانی تھی۔ جنگ سے پہلے بڈھے کی دوکان کا نام تھا "اطالوی سٹور" جنگ شروع ہوتے ہی اس نے یہ نام بدل کر "اینٹی اطالوی سٹور" کر دیا، حراست کے بعد اس سٹور کا نام "اتحادی سٹور" ہو گیا، دراصل اس بڈھے کو سیاست سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ میرا خیال ہے کہ اگر کل گل مرگ پر جنگل کے ریچھوں کی حکومت ہو جائے، تو یہی اطالوی بڈھا اپنی دوکان کا نام بدل کر "ریچھ سٹور" رکھ دیگا، اور ساتھ ہی جلی حروف میں یہ الفاظ بھی۔

"یہاں ریچھوں کو شہد مفت ملتا ہے۔!" لیکن فی الحال تو اس حکومت کے قیام کا کوئی گمان نہ تھا۔ جنگ شروع ہو جانے کے بعد میریا کا انگریزی خاندانوں میں آنا جانا بند ہو گیا تھا۔ اور پیانو سکھانے سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ اُدھر اطالوی یعنی اینٹی اطالوی یعنی اتحادی سٹور کی آمدنی بھی کم ہو گئی تھی۔ اس لئے حالت ذرا پتلی تھی۔ فردوس کے چھوٹے بیرے زمان خان نے یہ سب حالات دیکھ کر میریا پر اپنا دام پھینکا تھا۔ لیکن میریا قابو میں نہ آئی۔ بعض غریب لوگ بیحد ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ بڑی مشکل سے قابو میں آتے ہیں۔ میریا کا شمار انہی بڑی مشکلوں میں ہوتا تھا۔ زمان خاں اس کی وجہ سے بے حد پریشان تھا، ہوٹل کے بڑے بہشتی عبداللہ

کو اسی وجہ سے میریا اور اس کے باپ سے ہمدردی تھی۔ کیونکہ وہ خود ایک لٹا ہوا کسان تھا۔ سینے میں ایک زخمی دل رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی لڑائی زمان خاں اور چھوٹے بہشتی سے ہوئی، جو کرہ ثمر سات کا کام دلجمعی سے نہ کرتے تھے، اور زمان خاں نوکرہ ثمر سات کا کام کرنے کے بجائے لڑکی کو اُلٹا پریشان کرتا تھا۔ عبداللہ لڑائی میں بری طرح پٹ گیا۔ ہاتھ پاؤں پر چوٹیں بھی آئیں اور منیجر نے الگ ڈانٹا۔ کیونکہ کرہ ثمر سات کی دیکھ بھال زمان خاں اور ریوسنٹ کے سپرد تھی۔ عبداللہ کو دخل در معقولات کا کیا حق تھا۔ اب کے اس نے اپنی ہمدردی یوں ظاہر کی تو نوکری سے الگ کر دیا جائے گا۔

میریا مجھے پسند تھی۔ اس کا حسن صبیح، کنول کی طرح کھلا ہوا چہرہ۔ آنکھوں کی خطرناک معصومیت، جسم کے نازک خم، ہونٹوں کا وہ اُجلا اُجلا تبسم۔ لیکن میریا کی متانت مجھے بہت ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ میں چاہتا تھا۔ کہ یہ لڑکی سنجیدہ نہ رہے ان معصوم آنکھوں میں شوخی چھلکنے لگے۔ اس کنول کی پتیوں پر ہنسی کی تیتری رقصاں ہو جائے اس اجلے تبسم میں شرارت کی بجلی تڑپ جائے، اس کے سارے رگ و پے میں اک ایسی تھرتھری آئے کہ اس کی ہستی کا گوشہ گوشہ بیدار ہو جائے۔ اور اس کی حیات کا بہاؤ کسی طوفانی ندی کی طرح اُمڈتا ہوا نظر آئے۔

...... میریا...... میریا...... ایک دن پیانو پر Nutcracker کی دھن بجا رہی تھی، مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا۔ "یا تو تم نری احمق ہو، بے وقوف ہو،

جاہل ہو یا ......"

"یا - ؟ ...... ہاں کہو۔"

"یا تم عورت کے بھیس میں راسپوٹین ہو Nutcracker کی

دھن سن کر مجھ ایسے کور متراشیانی کا جی بھی ناچنے کو چاہتا ہے، اور ایک تم ہو کہ بجھے

ہوئے بلب کی طرح بالکل ٹھس بیٹھی ہو۔ کیا بات ہے آخر۔ ؟ اٹھو بھاگو، دوڑو

ناچو، ناچو، ناچتے ناچتے کہ تمہاری کائنات کا ذرّہ ذرّہ متحرک ہو جائے اور تمہارے

جسم کا ایک ایک خم تھک کر چور ہو جائے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر پیانو

پر سے اٹھا لیا۔ اور دو تین چکر کمرے میں تیزی سے ناچتے ہوئے لگائے، پھر یکایک ٹھہر

گیا، اب وہ میرے بازوؤں کے حلقے میں تھی۔ میں نے اس کے ہونٹ چومتے ہوئے کہا۔

"اس جنگ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ ؟"

اس نے اپنے آپ کو میرے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کر لیا۔ اور میرے منہ

پر ایک ہلکا سا طمانچہ مار کر بولی۔ "تم بڑے وحشی ہو جی۔"

میں نے کہا۔ "بس یہی غصہ دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے تمہاری اس مہین مسکراہٹ

سے سخت چڑ ہے، تمہارے انداز اطالوی لڑکیوں ایسے نہیں ہیں، وہ مجنونانہ جوش، وہ خرد شکن

وہ بے موقع ہنسی، اُچھل کود۔ وہ ـــــ وہ سب کچھ تم میں نہیں ہے۔ واللہ تم عورت

نہیں ہو۔ مرمر کا بت ہو اور یا تو تم اپنی زیست پہ دانستہ اس بھاری متانت کا دبیز

پردہ ڈالے ہوئے ہو، تاکہ لوگ تم سے مرعوب ہو جائیں۔ یور راسپوٹین گرل ......"

ادھر آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔"

وہ کہنے لگی۔ "جب تم میری عمر کو پہنچو گے۔ تو تمہیں معلوم ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "میں تم سے عمر میں دس سال بڑا ہوں۔"

میریا بولی۔ "میری مراد ذہنی عمر سے تھی۔ اصل عمر وہی ہوتی ہے۔ یوں تو شاید تم مجھ سے عمر میں دس سال بڑے ہو گے۔ لیکن تمہارا ذہن، تمہارا فہم تمہارا ادراک بالکل مرغی کے ایک چھوٹے چوزے کی طرح ہے۔"

"اچھا تو گویا میں ایک چوزہ ہوں۔" میں نے غصے سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ایک ناپختہ چوزہ۔!" یہ کہہ کر وہ مسکرائی، وہی متین، غم آلود مسکراہٹ۔

میں نے پوچھا۔ "اس جنگ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔"

وہ کہنے لگی۔ "جنگ...... جنگ...... تمہارا بوسہ بہت اچھا تھا۔ ...... جنگ بہت بری شے ہے۔ میں ایک عورت ہوں۔ میں آدمی کے بوسے کو سمجھ سکتی ہوں۔ اس کے قاتلانہ جذبے کو نہیں سمجھ سکتی، یہ کشت و خون کیوں ہوتا ہے۔ میرا بھائی اس وقت فوجی قیدی ہے۔" اس کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔

میں نے کہا۔ "معاف کرنا۔ یہ جنگ تمہارے فسطائیوں نے شروع کی ہے۔"

وہ بولی۔ "میں فسطائی نہیں ہوں نہ ہی میرا بھائی تھا۔ میرا باپ چھتریاں بناتا ہے۔ اور رات کو Concertina پر گانا پسند کرتا ہے۔ مجھے پیانو

سے عشق ہے۔ میں نے کبھی سیاست کے متعلق نہیں سوچا، ہمیشہ آزاد اور لاتعلق سی رہی اس لئے مجھے فسطائیت پسند نہیں جب میں پیدا ہوئی تو عہد نامہ ورسائی پر دستخط ہو چکے تھے اور میں ہندوستان میں تھی۔ مجھے مسولینی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اس نے تو میرا پیانو سکھانا بھی بند کر دیا۔"

اس کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ میں نے کہا۔ "تم کسی پولیس آفیسر کے سامنے بیان نہیں دے رہی ہو۔"

وہ بولی۔ "مجھ سے تو سب ہی پولیس آفیسر دوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ میرے لئے یہ نئی بات نہیں ہے۔ لیکن دراصل یہ ہماری غلطی تھی، ہم خوشی کے راگ الاپتے رہے concertina بجاتے رہے، اور سیاست سے بے بہرہ رہے اور ہم نے فسطائیوں کو من مانی کارروائی کرنے کا موقع دیا" اس کی سانس رکنے لگی۔

میں نے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا۔ "اچھا چلو۔ جانے دو۔ .... یہ آخری جنگ نہیں ہے۔ اگر ہم لوگ پچیس تیس برس اور زندہ رہے۔ تو لوگ اور جنگیں دیکھیں گے اس سے کہیں زیادہ بھیانک اور خوفناک جنگ، یہ جنگ فسطائیوں کو ختم کر دے لیکن مشرق و مغرب کے نازک مسائل کو نہ سلجھا سکے گی۔ نہ یہ دنیا اس نظام کی بنیاد رکھ سکے گی۔ جس کے بغیر بھوک، بے کاری اور جہالت کا اس دور سے دور ہونا ناممکن ہے۔ اس لئے آؤ، اسے تھوڑی Some دیر کرو تاکہ اس زندگی کی حرماں نصیبی اور اپنے محبوب .... اچھا سا

زائل ہو جائے ......"

میریا نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور پیانو بجانے لگی۔

۹

چاندنی رات تھی، میں اور اوبرائن کھانے کے بعد بالکونی میں بیٹھے ہوئے اپنے تخیل میں پرستانی قلعے تعمیر کر رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ الپیتھر کی جھیل کے وسط میں برف کے گلیشروں کے درمیان، ایک خوبصورت محل ہو، اور اس میں میریا ہو اور ایک بہت بڑا پیانو۔ چاندی کا اور میریا کا لباس سیب کے پھولوں کا ہو .... اور میریا ہو۔ اور میں ــــــ اور بس اور کوئی نہیں .... اور کہیں کا۔ لوگ یہ کہے مر رہے ہیں۔ کہ اک چاندی کا پیانو، جھیل کے وسط میں ایک محل ہو، یہ ہو۔ وہ ہو .... بس ہمیشہ یہی مصیبت ہوتی ہے۔ ایسے خوبصورت سپنے اسی طرح جلد ٹوٹ جاتے ہیں۔ لیکن آدمی ایسے خواب کیوں دیکھتا ہے، آدمی سے مراد کیا چیز ہے، عبداللہ بھی تو آدمی ہے، عبداللہ نے بھی کبھی ایسے خواب دیکھے تھے۔ اب بھی اپنے بیٹے کے لئے شب و روز ایسے ہی سپنے دیکھتا ہے۔ انسان کو یہ سپنوں کی دنیا کیوں پیاری ہے۔ اور کیوں وہ ان سپنوں کو حقیقت نہیں بنا لیتا، سورج، پانی، چاند ہوا کی طرح اگر زمین اور اس کی ساری پیداوار بھی سب

انسانوں میں مشترک ہو جائے، تو ہر گھر ان سندر سپنوں کا جگمگاتا ہوا شیش محل بن جائے، پھر انسان ایسا کیوں نہیں کرتا۔ وہ کیوں غاصب ہے اشتراکی کیوں نہیں، کیا اس میں اتنی سی عقل بھی نہیں کہ اس سیدھی سادی بات کو سمجھ لے......

اوبرائن سگار کی راکھ جھاڑ کر بولا۔ "ہنری فورڈ کا لڑکا مر گیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر۔؟ اس سے موٹروں کے کاروبار پر کیا اثر پڑے گا، شہتوت کے درختوں پر پھل لگنے بند ہو جائیں گے کیا۔؟"

اوبرائن بولا۔ "نہیں دراصل غور کر رہا تھا۔ کہ وہ ہنری فورڈ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ہنری فورڈ امریکہ میں سرمایہ داری کا مظہر ہے...... اب میں سوچتا ہوں، سرمایہ دار ہنری فورڈ خوش ہے۔؟ خوش تھا۔ خوش رہے گا۔؟ آخر یہ دولت کے انبار کیوں۔؟ ان کا مصرف ہی کیا ہے۔ جبکہ ہنری فورڈ دو بسکٹ اور آدھ پاؤ دودھ بھی دن میں ہضم نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا۔ "ہنری فورڈ بہت بڑا آدمی ہے وہ اس قدر محنت کرتا ہے کہ کچھ کھا نہیں سکتا۔"

اوبرائن بولا۔ "ماؤنٹ ایورسٹ بھی بہت بڑا پہاڑ ہے۔ بڑائی دونوں میں ہے۔ ہنری فورڈ میں بھی۔ لیکن ہنری فورڈ کی عظمت غیر فطری ہے۔ مصنوعی ہے۔ اس کی حیثیت غاصبانہ ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ کی دلکشی اک معصوم بچے کی سی ہے جو سپید برف سے کھیل رہا ہو۔ گو وہ ابدی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "گاندھی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔"

اوبرائن بولا۔ "ایک مدت تک مجھے کالے آدمیوں سے نفرت رہی اب بھی کبھی یہ نفرت جاگ اٹھتی ہے۔ مجھے ان کا رنگ پسند نہیں، ان کا احساس کمتری پسند نہیں، ان کا خوشامدانہ لہجہ پسند نہیں، میرا خیال رہا ہے کہ ان میں بلی کی سی چالاکی اور لومڑی کی سی دھوکا بازی پائی جاتی ہے۔ اور حبشیوں کو تو میں مدتوں انسان سمجھنے سے انکار کرتا رہا۔۔۔۔۔۔ گاندھی کالا آدمی ہے۔ وہ کبھی سفید آدمی کا دوست نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگ اسے یسوع مسیح کی طرح معصوم سمجھتے ہیں۔ میں اس دھوکے میں مبتلا نہیں ہوں۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ وہ سفید نسل کے انسانوں کا جانی دشمن ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ ہندوستان میں ہی ہندوستانیوں کی حکومت ہو۔" اوبرائن بالکونی پر جھک گیا۔ بولا۔ "ممکن ہے میرے جذبات عصبیت سے خالی نہ ہوں۔ آخر میں بھی سفید نسل سے تعلق رکھتا ہوں۔ لیکن اس وقت اس نے ہمیں سخت مشکل میں ڈال دیا ہے۔

ہندوستان بھر میں اک آگ سی پھیلی ہوئی ہے۔ اور یہ بدامنی ہمیں جاپانیوں کا مقابلہ کرنے سے روک رہی ہے۔"

عین اسی وقت دور سے بگل بجنے کی آواز آئی، اور بہت سے گھوڑوں کی ٹاپ، انگریز گھڑ سواروں کا ایک قافلہ ہماری بالکونی کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ یہ

یہ لوگ پستولوں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔ آگے آگے دو انگریز بگل بجا رہے تھے۔

یہ قافلہ بالکونی کے نیچے سے گزرتا ہوا گاف کورس کی طرف چلا گیا۔

میں نے کہا؛ بداعتمادی سے بداعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ یہ زریں کا اصول ہے۔ انگریزوں کو ہندستانیوں کی جمہوریت پسندی پر اعتماد نہیں۔ اور ہندستانیوں کو انگریزوں کی ہمدردی اور دانشمندی پہ، اب دیکھیے، یہاں گلمرگ میں کوئی خطرہ نہیں لیکن یہاں بھی یہ لوگ بلا ناغہ رات کو گشت کرتے ہیں اور ایک بنگلے سے دوسرے بنگلے تک گھومتے ہوئے سارے گلمرگ کا چکر لگاتے ہیں۔ مبادا کہیں کوئی کانگریسی بم پھینک دے۔"

سرکلر روڈ کی سمت سے وہ نوجوان جوڑا چلا آرہا تھا۔ چاندنی میں سرشار اور دل آسودہ، امنگوں سے لبریز، نچلی منزل میں مس جانسن جو لنکا شائر کی رہنے والی تھی۔ نہایت اداس سُروں میں اپنے وطن کا ایک دیہاتی گیت گا رہی تھی۔ اس کا بیا یار شرابی لہجہ میں بار بار کہہ رہا تھا۔ "ڈارلنگ۔ میں بھی لنکا شائر کا رہنے والا ہوں۔ ڈارلنگ۔ میں بھی لنکا شائر کا رہنے والا ہوں۔"

چاندنی میں نہائے ہوئے بت ممیں کو اپنی آغوش میں لیکر نوجوان لڑکا سڑک پر کھڑا ہو کر وہیں اپنی بیوی کو چومنے لگا۔

نچلی منزل پہ یکایک نرس رونے لگی۔ "میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ ڈارلنگ۔ ہوائے میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

اوبرائن کہنے لگا۔ "انسان ابھی جغرافیائی عشق سے آزاد نہیں ہوا۔ گاندھی ہندوستانی ہے۔ اسے ہندوستان سے عشق ہے۔ یہ نرس لنکا شائر کی رہنے والی ہے اسے لنکا شائر سے عشق ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ گلمرگ کے مقابلے میں لنکا شائر بالکل...... " وہ سر ہلا کر چپ ہو گیا۔

میں نے کہا۔ "پرسوں بگی مل کی دکان پر میری ملاقات ایک انگریز عورت سے ہوئی۔ وہ انگلستان کی لیبر پارٹی کی ممبر تھی۔ وہ بھی تمہاری طرح گاندھی کو برا بھلا کہہ رہی تھی، کہتی تھی کہ اب گلمرگ میں بھی فساد ہوگا، اور یہی لوگ جو آج ہمارے پاس شہد، ڈبل روٹی، اور شلغم بیچنے کے لئے آتے ہیں، ہم پر چھروں اور لاٹھیوں سے حملہ کریں گے پھر وہ مسکرا کر کہنے لگی بہتر یہ ہے کہ میں ان لوگوں کے ہاتھوں ماری جاؤں جو مجھے جانتے ہیں۔ مجھے اجنبیوں کے ہاتھوں سے مرنا پسند نہیں۔"

اوبرائن بولا۔ "تم نے اس طنز کا لاحظ کیا۔؟"

میں نے کہا۔ "یہ طنز سراسر غلط تھی۔ گاندھی کسی انگریز کو قتل کرنا نہیں چاہتا اور پھر اس انگریز عورت کو جو لیبر پارٹی کی ممبر بھی تھی۔ ہندوستانیوں سے اس قدر خوف کیوں محسوس ہو رہا تھا۔ یہ آپنی بد اعتمادی کس لئے۔ تمہارے خیال میں کیا اس میں رتی بھر احساسِ گناہ شامل نہ تھا۔؟"

نیچے، نرس اب زور زور سے چلا رہی تھی۔ "میں لنکا شائر جانا چاہتی ہوں۔ بتی بلوائیے۔ میں لنکا شائر جانا چاہتی ہوں، تسلی بلوائیے......"

اور براؤن مسکرا کر کہنے لگا ...... "اور یہی گاندھی چاہتا ہے۔"

یکایک عبداللہ کا لڑکا غریب بھاگتا ہوا آیا۔ اور چھوٹتے ہی بولا۔

"بابوجی بابوجی! ابا کو کچھ ہو گیا ہے۔ ابھی چنگے بھلے تھے۔ بیٹھے حقہ پی رہے تھے، پھر کھانسنے لگے۔ اور ایک دم چپ ہو گئے۔ ہم نے کہا۔ ابا۔ ابا، وہ نہیں بولے وہ بولتے ہی نہیں بابوجی ......" میں بھاگتا بھاگا پیچھے گیا، عبداللہ اپنی کوٹھری میں مرا پڑا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں اوپر کو چڑھ گئی تھیں۔ سپنوں کا انتظار کرتے کرتے، ہائے کتنی ناامید تھی ان آنکھوں میں، یہ سپنے کبھی سچے نہیں ہوتے۔

منیجر دروازے تک بھاگا ہوا آیا۔ اس نے عبداللہ یا میری طرف دیکھا تک نہیں غریب کو دیکھ کر بولا: "منیجر صاحب کے لئے ــــ گرم پانی چاہیئے۔ جلدی ٹب بھر دو۔"

اور وہ بھاگتا ہوا واپس چلا گیا۔

غریب نے قاعدہ زمین پر رکھ دیا۔ اور بالٹی اٹھانے لگا۔

"میرے ابا کو جگا دیجئے۔" اس نے مایوسانہ لہجہ میں نہایت لجاجت سے کہا۔ "میں میجر صاحب کے لئے پانی رکھ آؤں۔"

قریب کسی کمرے سے آواز آ رہی تھی۔ لنکا شائر کی رہنے والی نرس کو اس کا بیٹا بار بار چوم رہا تھا۔ اور اسے مخصوص شرابی لہجہ میں دلاسا دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میں تجھے لنکا شائر لے جاؤں گا۔ مگ یو مائی بے بی۔ میں تجھے لنکا شائر لے جاؤں گا۔ مگ یو سویٹی۔"

عبداللہ آج ہی کیوں مرا، ایسی خوبصورت چاندنی رات میں، وہ نوجوان

نیکا اور فرنٹ کی ابھی تک گلمرگ کی چاندنی میں نہا رہے تھے۔ ہواؤں میں جنگلی پھولوں

کی مہک بسی ہوئی تھی، کیا عبداللہ آج سے چند سال بعد نہ مر سکتا تھا۔ شاید اس کا بیٹا پڑھ

لکھ کر اس کے تخیل کے سپنے سچے کر دیتا۔ یعنی یہ کون سا طریقہ ہے مرنے کا۔ کہ صاحب لوگوں

کے لئے پانی کی بالٹیاں بھرتے بھرتے مر گیا۔ کیا وہ اپنے کھیتوں میں، اپنے چھوٹے سے باغیچے

میں، اپنے مٹی کے گھر میں مر سکتا تھا۔ میں پوچھتا ہوں، یہ کیا مذاق ہے۔؟ اس طرح مرنے

کا کیا حق تھا۔ وہ اس طرح کیوں فاقے کرتے کرتے، ایڑیاں رگڑتے رگڑتے جھوٹے

سپنے دیکھتے دیکھتے مر گیا۔ دنیا میں یہ لاکھوں، کروڑوں عبداللہ شب و روز اس طرح کیوں

مرتے ہیں۔ کیوں جیتے ہیں۔ کیوں رہتے ہیں۔؟ یہ کیا مذاق ہے۔ کیا تماشا ہے

کیسی خدائی ہے۔؟

"عبداللہ، اے سور کے بچے، میجر صاحب پانی مانگ رہے ہیں۔" میجر

کہیں دور سے چلایا۔ بول بول۔ اے سور کے بچے، سپید سپید تتلیوں والے غلیظ

بڈھے، گنجی چاند والے، کھردرے ہاتھ پاؤں والے، نیم برہنہ فاقہ مست انسان

بول! کیا مر کر بھی تجھے گالی کا جواب دینا نہ آئے گا۔

※

فردوس میں دیکھے ہوئے کچھ عجیب سے چہرے یاد آ رہے ہیں، ایک سکھ اور

اس کی خوبصورت بیوی جو گلمرگ میں پہاڑ کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ سردار کی بیوی تھوڑی پر انگلی رکھ کر بڑے نخرے سے کہنے لگی۔ "اے ہے۔ یہاں ہے کیا۔ ؟ بس پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔ مجھے تو کشمیر ذرا بھی اچھا نہ لگا، بس یہاں ہے کیا۔ پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔ گیوں سکے کتے۔"!

ایک بوڑھا پنشن یافتہ وزیر، اور اس کے ساتھ ایک غریب انگریز پادری فوج میں ملازم تھا۔ سرکاری فوج میں عیسائیت کا مبلغ، پھر بھی یہ احساس کمتری اسے کھائے جاتا تھا کہ ہائے وہ پادری ہے۔ کاش وہ تاجر، سپاہی، ایکٹر یا منسٹر کیوں نہیں، پادری، کتنی بیچارگی تھی ان آنکھوں میں، وہ پریشان کھوئی کھوئی آنکھیں۔

بوڑھا وزیر ہر وقت اپنے بڑے لڑکے کا ذکر کرتا جو سکاٹ لینڈ میں تھا۔ اور ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی ایک سکاچ کے گھر پر ورش پا رہا تھا۔ بوڑھا وزیر بڑے فخر سے اس امر کو بار بار ہوٹل کے ملاقاتیوں کے سامنے دہراتا۔

جمال میرا بیٹا ہے۔ جمال سکاٹ لینڈ میں ہے۔ جمال میرا بیٹا۔ جمال سکاٹ لینڈ میں ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک اور بری عادت بھی تھی۔ وہ میری بالکونی میں مجھ سے اجازت لئے بغیر آ بیٹھتا۔ اور پھر میرا باتھ روم بھی استعمال میں لے آتا۔ جو بالکونی سے کچھ فاصلے پر ہی تھا۔ ایک دن میں نے چڑ کر کہا۔ "صاحب آپ یہ بالکونی اور یہ باتھ روم میری اجازت کے بغیر استعمال نہیں کر سکتے۔"

"کیوں۔ ؟" اس نے بے حد ناراض ہو کر پوچھا۔

"اس لئے کہ جمال آپ کا لڑکا ہے۔ اور جمال سکاٹ لینڈ میں ہے اور جب تک وہ ذاتِ شریف یہاں تشریف لائیں۔ میں آپ کو آپ کے پادری دوست سمیت اس بالکونی سے نیچے پھینک دینے کا خوفناک ارادہ رکھتا ہوں۔"

"لیکن آپ مجھے نہیں جانتے۔" اس نے اور بھی برافروختہ ہو کر کہا۔ "یہاں کے سب لوگ۔ سب بڑے بڑے لوگ میرے دوست ہیں۔ میں منسٹر رہ چکا ہوں۔ اور وائسرائے بہادر کا مہمان بھی، میں آپ کو جیل بھجوا سکتا ہوں۔ آپ کس سے بات کر رہے ہیں۔ میرا لڑکا جمال سکاٹ لینڈ میں ہے۔"

میں نے تہدیدی انداز میں اسے گھونسا دکھاتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہوگا کہ آپ بھی سکاٹ لینڈ تشریف لے جائیں۔ کم از کم بالکونی کی طرف تشریف نہ لائیں ورنہ۔"

پانچ چھ تماشا دیکھنے والے ملاقاتی اکٹھے ہو گئے۔ آپ نے ان کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ میری اس طرح کوئی بے عزتی کرے۔ میں پنشن یافتہ منسٹر ہوں۔ میرا لڑکا جمال سکاٹ لینڈ میں ہے اور......"

پادری اسے گھسیٹ کر پرے لے گیا۔

ایک ہندوستانی لڑکی آئی تھی۔ کمرہ نمبر بیالیس میں آکر رہی۔ نہ وہ ایکٹریس معلوم ہوتی تھی۔ نہ ہیڈ مسٹرس، نہ طوائف، نہ شادی شدہ خاتون لیکن پھر بھی اکیلی آئی تھی۔ اور جتنے دن گلمرگ میں رہی۔ اکیلی رہی اور اکیلی ہی واپس گئی۔

اوبرائن کہنے لگا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر میرے دل میں اپنی محبوبہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ بالکونی کے منظر نے مجھے اس سے بھی متعارف ہونے کا موقع دیا۔ اوبرائن نے پوچھا۔ "کیا آپ پچھلے جنم میں کسی آئرش خاندان میں پیدا ہوئی تھیں۔؟"

اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔ "مجھے یاد نہیں۔"

ہائے کیا بھولپن تھا۔ کتنی پیاری معصومیت تھی۔ اوبرائن کا برا حال ہو گیا کہنے لگا۔ "ہو نہو۔ یہ وہی ہے۔ مجھے دھوکا دینے کے لئے ہندوستانی لڑکی کے بہروپ میں آئی ہے۔ چند روز اور یہاں رہی۔ تو میں مر جاؤں گا۔ میرا سارا فلسفہ ختم ہو جائیگا...... مجھے یاد نہیں۔ ہائے ہائے......"

خیریت ہوئی۔ کہ چند روز کے بعد وہ واپس چلی گئی۔

٭

بالکونی میں ایک سہانی دوپہر، لطیف، خنک دھوپ، پلیٹوں میں سیب اور مصری آلوچے، میریا کی سنہری باہیں۔ اور پھول کی کلیوں کی طرح نازک انگلیاں..... میریا کہنے لگی۔ "وہ پک نک تمہیں یاد ہے۔ ہم دونوں نے فیروز پور کے نام نے میں مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کی تھی۔؟"

"اور ...... کے محکمے کے ایک کارکن نے ہمیں بلا اجازت مچھلیاں

پکڑنے پر گرفتار کرنا چاہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اُم۔۔۔۔۔اُم۔۔۔۔۔" اس نے ایک اور آلوچہ اٹھاتے ہوئے کہا: "میرا مطلب ہے کہ وہ پک نک بری تو نہ تھی اب پھر کبھی چلو۔ اب کے ہم Fisheres کے محکمے سے اجازت بھی لے لیں گے۔"

میں نے کہا: "مجھے تو اس پک نک میں صرف اخروٹوں کا نالہ پسند آیا تھا اور بید مجنوں کا جھنڈ جہاں نالے کا پانی بھی سویا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور بید مجنوں کی شاخیں پانی پر جھکی تھیں۔

"اور چنار کے پتوں کا رنگ شرابی تھا۔" میریا نے خوابیدہ لہجہ میں کہا۔

"بالکل تمہارے ہونٹوں کی طرح۔!" میں نے شوخی سے کہا۔

"بچے ہو۔ بس مٹھائی دیکھ کر للچا جاتے ہو۔ تمہیں تو عشق کرنا آتا نہیں۔" میریا نے ایک سنجیدہ تبسم کے ساتھ کہا۔ "شاید اسی لئے تم مجھے اسقدر پسند ہو۔"

بہت دیر تک خاموشی رہی۔ میں اپنی کھال سہلاتا رہا۔

"پھر۔" وہ بولی۔ "جنگ کے بعد میں اپنے وطن واپس چلی جاؤنگی۔ وہاں اشتراکی پارٹی میں شامل ہو کر سیاسی کام کروں گی۔ پیانوں بجانے سے کام نہ چلے گا۔ یہ کمبخت جنگ ختم ہو جائے۔ پھر ہم سب مل کر پوری پوری کوشش کرینگے۔ کہ جنگ، دوبارہ نہو، کیوں ٹھیک ہے نا۔!"

میں نے کہا۔ "مجھے بھی ساتھ لیتی چلوگی۔"

"نغرود۔" وہ مسرت بھرے لہجہ میں بولی۔ "ہمارا گاؤں لومبارڈی میں ہے۔
وہاں انگور کی بیلیں ہیں اور شہتوت کے درخت اور کھیتوں کے کنارے
لائم کے پیڑ، تب تک میرا بھائی بھی آزاد ہو جائے گا۔ پھر ہم سب مل کر کھیت بوئیں گے۔
اور ریشم کے کوے اکٹھے کریں گے۔ اور پاپا کو ایک اونچی سی کرسی پر بٹھا کر اصل اطالوی
شراب پلائیں گے۔ اور کبھی ——— کبھی جنگ نہ ہونے دینگے۔"

دوسرے دن میریا اور اس کے باپ کو پولیس نے پھر حراست میں لے لیا یہ
گرفتاری بطور حفظِ ماتقدم عمل میں لائی گئی تھی۔ جنگ آخر جنگ ہے اور فی زمانہ
اشتراکی اطالویوں اور فسطائی اطالویوں میں تمیز کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔
اور گو حکام کو ان دونوں افراد پر شبہ نہ تھا۔ پھر بھی احتیاط لازم تھی۔

چلتے وقت میریا کے باپ نے مجھے ایک چھڑی بطور تحفہ پیش کی۔

میریا نے ایک حزیں مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اور میں تمہیں کیا دوں،
نابخت جوزے!"

میں نے پیانو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "میں تم سے نغمۂ بہار سننا چاہتا
ہوں بے تھوون کا نغمۂ بہار۔ میرا یقین ہے کہ بہار ضرور آئیگی۔"

وہ پیانو پر نغمۂ بہار بجانے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور
نغمے کی پنہائیوں میں خوش الحان طیور چہچہانے لگے۔ پھولوں بھری ڈالیاں لہرانے
لگیں۔ شہتوت کے پتے خوشی سے ناچنے لگے۔ بلبل کے نغمے اور عورتوں کے مسرت

بھرے قہقہے، اور بے فکر بچوں کی معصوم شوخیاں۔

بہار !........ بہار !! .... بہار !!! ....

میریا کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

بہار ضرور آئے گی، ایک دن انسان کی اجڑی کائنات میں بہار ضرور آئیگی۔

یہ نغمہ کہہ رہا ہے۔ میریا، ترے آنسو بیکار نہ جائیں گے۔ !

ختم شُد